BOOK HOME

شہرہ آفاق فلسفی روسو کی آپ بیتی

# اعترافات

ژاں ژاک روسو

شہرۂ آفاق فلسفی روسو کی آپ بیتی

# اعترافات


مصنف: ژاں ژاک روسو

مترجم: امجد علی بھٹی





BOOK HOME

THE CONFESSIONS

*By: Jean Jacques Rousseau*

# اعترافات

مصنف: ژاں ژاک روسو

مترجم: امجد علی بھٹی



اہتمام رانا عبدالرحمٰن

پروڈکشن ایم سرور

سرورق ریاظ

کمپوزنگ محمد انور

پرنٹرز حاجی حنیف پرنٹرز، لاہور

اشاعت 2006ء

ناشر بک ہوم لاہور
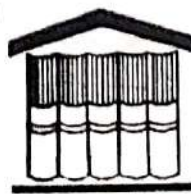
بک سٹریٹ 46- مزنگ روڈ لاہور۔ فون:042-7231518-7245072

E-mail:bookhome1@hotmail.com - bookhome_1@yahoo.com

# فہرست

# پیش لفظ

فرانسیسی انقلاب کا ''روحانی باپ'' ژاں ژاک روسو 1712ء میں جنیوا میں پیدا ہوا۔ ''اعترافات'' اس کی خودنوشت سوانح حیات ہے، جس پر روسو نے اپنی زندگی کا ہر پہلو ہمارے سامنے کھول کر رکھ دیا ہے۔ روسو کی اس شہرۂ آفاق آپ بیتی کا دنیا کی بڑی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ بک ہوم اس سے پہلے روسو کی معرکتہ آلاراء کتاب Social Contrat کو اُردو میں ''معاہدۂ عمرانی'' کے نام سے شائع کر چکا ہے۔ جس کا ترجمہ ممتاز دانشور محمود حسین نے کیا ہے۔

ہمیں اُمید ہے کہ قارئین کو روسو کی آپ بیتی پسند آئے گی کیونکہ بک ہوم اس سے پہلے دنیا کے نامور افراد کی آپ بیتیاں اور سوانح عمریاں شائع کر چکا ہے جن میں ڈاکٹر طٰہٰ حسین، حضرت معین الدین چشتیؒ، مولانا جلال الدین رومیؒ، حضرت نظام الدین اولیاءؒ، حضرت امیر خسرو، علامہ محمد اقبال، گوتم بدھ، ایڈیسن، آئن سٹائن، لینن، غالب، ذوالفقار علی بھٹو، سید سجاد ظہیر، میلکم ایکس، اے پی جے عبدالکلام آزاد اور گوپال متل کی آپ بیتی قابل ذکر ہے۔ جسے ملک بھر قارئین نے بہت پسند کیا۔

روسو کی آپ بیتی بک ہوم کی طرف سے شائع شدہ آپ بیتیوں کے گلدستے میں ایک قیمتی پھول کا اضافہ ہے۔

امجد علی بھٹی

# پہلی کتاب

(1712-1728ء)

میں نے ایک ایسے کام کا آغاز کیا ہے جو اس سے قبل کسی نے نہیں کیا اور اس کام کی تکمیل کے بعد اُس کی تقلید کرنا ممکن نہ ہوگا۔ میں اس دنیائے فانی کے سامنے ایک ایسے انسان کو پیش کرنا چاہتا ہوں جو فطرت خلقی کا مظہر ہو اور وہ انسان میں خود ہوں۔

میں نے انسان کو پرکھا ہے اور مجھے یقین ہے کہ میں دوسرے لوگوں سے قطعاً مختلف ہوں' اُن سے بہتر نہ سہی لیکن میں دعویٰ کرتا ہوں کہ میں نے اپنی اصلیت کو برقرار رکھا ہے۔ قدرت نے میرے ساتھ صحیح کیا کیا غلط سانچے کو تلف کرنا صحیح تھا یا غلط اس بات کا فیصلہ تو مجھے پڑھنے کے بعد ہی کیا جاسکتا ہے۔

روزِ قیامت جب آخری بگل بجایا جائے گا میں اپنی یہ کتاب ہاتھ میں لیے خود کو (اُس) منصف عظیم کے سامنے پیش کروں گا اور بآواز بلند یہ اعلان کروں گا کہ میں نے (ہمیشہ) اپنی سوچ کے مطابق عمل کیا کیونکہ میں تھا ہی ایسا۔ میں نے ہر وہ بات جو کہ قابل تعریف یا قابل اعتراض تھی، پوری آزادی اور سچائی سے بیان کی ہے۔ نہ میں نے کوئی جرم چھپایا اور نہ ہی اپنے آپ میں کسی خوبی کا اضافہ کیا۔ اگر کبھی میں نے مبالغہ آرائی سے کام لیا بھی تو اس کا مقصد صرف اپنی کمزور یاداشت سے پیدا ہونے والے خلا کو پُر کرنا تھا۔ شاید میں نے کسی ممکنہ بات کو فرضیت کا روپ دیا ہو' مگر کبھی جانتے بوجھتے جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی۔ میں جیسا تھا، خود کو دوسروں پر ویسا ہی ظاہر کیا' کبھی بہت حقیر، ذلیل اور کبھی بہت نیک، فیاض اور (ان سے) برتر۔ اگرچہ لافانی طاقت میرے پوشیدہ رازوں سے واقف ہے، پھر بھی میری خواہش ہے کہ وہ اپنے سامنے تمام انسانوں کو جمع کرے اور انہیں میرے اعترافات سننے کا موقع دے' انہیں میری محرومیوں پر شرسار ہونے دے۔ میری تکلیفوں کو محسوس کرنے دے اور اگر وہ تمام انسان اسی سچائی کے ساتھ اپنی ناکامیوں اور گمراہیوں کا اعتراف نہ کرسکیں تو پھر یوں سمجھیں میں ان سے بہتر انسان ہوں۔

میں آئزک روسو اور ''سوسانہ برنارڈ'' کے ہاں 1712ء میں جنیوا میں پیدا ہوا۔ میرے والد ایک ماہر گھڑی ساز تھے اور یہ ان کا واحد ذریعہ معاش تھا۔ اُن کی آمدنی پندرہ بچوں کو پالنے کے

لیے ناکافی تھی۔ میری والدہ کا تعلق ایک متمول خاندان ''مونز'' سے تھا۔ برنارڈ ایک پادری تھے اور ان کی بیٹی انکساری اور خوبصورتی کی مالکہ تھی۔ اس وجہ سے میرے والد کو ان کا ہاتھ مانگنے میں خاصی دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔

ان دونوں کی محبت ان کے وجود کی طرح قدیم تھی۔ آٹھ نو سال کی عمر میں وہ دونوں دریائے آئرلی کے کنارے اکٹھے چہل قدمی کیا کرتے تھے۔ دس سال کی عمر (سے قبل) اُن کے لیے ایک دوسرے سے جدائی کا تصور کرنا بھی دشوار تھا۔ قدرت نے ان دونوں کو ایک غمگسار اور ہمدرد روح عطا کی تھی جس نے انہیں ایک دوسرے کے لیے پسندیدگی کے جذبات سے باخبر رکھا۔ ان کے ذہن نرم اور نفیس احساسات سے جلد متاثر ہو جایا کرتے تھے۔ بس ایک جیسے رجحانات کی کمی تھی اور انہیں خوش قسمتی سے وہ لمحہ مل گیا جس میں انہوں نے اپنا آپ ایک دوسرے کو سونپ دیا۔

ان کی راہ میں حائل رکاوٹوں نے دونوں کی محبت کو مزید بھڑکایا' محبوب کا دل اپنی محبوبہ سے دور رہ کر دکھ اور اداسی کے جذبات سے بھر گیا۔ محبوبہ نے اسے خود کو بھول جانے کے لیے سفر کرنے کا مشورہ دیا، جس کے سامنے اس نے سر تسلیم خم کیا۔ وہ اس سے دور چلا تو گیا لیکن محبت میں مزید سرشار ہو کر واپس لوٹا لیکن اُسے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ وہ بھی اس کی محبت میں اتنی ہی سرشار تھی۔ اس (آخری) ثبوت کے بعد وہ اپنا جیون ایک دوسرے کے نام کرنے کے علاوہ اور کیا عزم کر سکتے تھے۔ جس کی تصدیق انہوں نے ایک ایسے عہد سے کی جس میں قدرت کی مرضی بھی شامل تھی۔

خوش قسمتی سے میری والدہ کے بھائی (جبریل برنارڈ)' میری پھوپھی کی محبت میں گرفتار ہو گئے۔ میری والدہ کو اس رشتے پر کوئی اعتراض نہ تھا لیکن انہوں نے اپنی شادی کو اس رشتے سے مشروط کر دیا۔ محبت نے تمام رکاوٹوں کو دور کر دیا اور دونوں شادیاں ایک ہی دن طے پائیں۔ لہٰذا میرے ماموں ___ میرے خالو بھی بن گئے اور ان کے بچوں سے ہمارا دوہرا (حقیقی) رشتہ بن گیا۔ ایک سال کے بعد دونوں کو باپ بننے کی خوشی ملی لیکن پھر انہیں مجبوراً اپنے خاندان علیحدہ کرنے کا فیصلہ کرنا پڑا۔

میرے ماموں جبریل برنارڈ جو کہ پیشے کے لحاظ سے انجینئر تھے، فوج میں بھرتی ہو کر 'ہنگری'' چلے گئے' جہاں اس زمانے میں شہزادہ یوجین کی حکومت تھی۔ انہوں نے جنگ اور اس سے پہلے والے بلغراد کے محاصرے میں بھی نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ میرے والد میرے اکلوتے بھائی کی ولادت کے بعد بذریعہ سفارش قسطنطنیہ چلے گئے۔ جہاں وہ ''سراگلیو'' میں خاص گھڑی

ساز مقرر کیے گئے۔ اُن کی غیر موجودگی میں میری ماں (۱) اپنی خوبصورتی، عقل وفراست اور شائستہ طبیعت کی وجہ سے لوگوں کے لیے کشش کا باعث بنی رہی؛ جن میں اکثر کا تعلق طبقہ اشرافیہ سے تھا۔ مونز دی کلوژر جو کہ ایک فرانسیسی تھا، ان سب میں پیش پیش تھا۔ اس کی محبت اتنی شدید تھی کہ تیس سال بعد بھی وہ میری ماں کا نام سنتے ہی جذباتی ہو جایا کرتا تھا۔ میری ماں کے پاس اپنی عصمت اور خود کو بچانے کے لیے ایک اور طاقتور ہتھیار تھا یعنی میرے والد سے بے پناہ محبت۔ انہوں نے میرے والد سے واپس آنے کی درخواست کی۔ میرے والد کی محبت نے ان کے لیے واپسی کا فیصلہ آسان بنا دیا اور وہ ترقی کے تمام احکامات کی پرواہ کیے بغیر جنیوا واپس آ گئے۔

میں اپنے والد کی واپسی کا بدقسمت نتیجہ تھا، جو کہ ان کے آنے کے دس مہینے بعد پیدا ہوا 'پیدائش کے وقت میری صحت بہت کمزور تھی' میری ماں مجھے جنم دیتے ہی اپنی جان گنوا بیٹھی۔ یہ میری پہلی بدقسمتی تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ میرے والد نے اس صدمے کو کیسے برداشت کیا؟ لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ اس کے بعد وہ ہمیشہ افسردہ اور غمگین رہے۔ انہیں ہمیشہ مجھ میں میری والدہ کا عکس نظر آتا تھا، جنھیں کھونے کا دکھ انہیں پل پل ستاتا رہتا تھا۔ وہ یہ کبھی نہ بھلا سکے کہ میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس حادثے کا باعث تھا۔ انہوں نے مجھ سے کبھی اپنی محبت کا والہانہ اظہار نہ کیا۔ ان کی آہیں اور کپکپاتے ہاتھوں سے مجھے اپنی آغوش میں لینا اس بات کا ثبوت تھا کہ ان کے پیار میں ایک دکھ بھی چھپا ہوا تھا اگرچہ اس حالت میں' وہ جب مجھ سے یہ کہتے چلو تمہاری والدہ کے متعلق بات کریں، تو میرا جواب ہمیشہ یہی ہوتا کہ ٹھیک ہے مجھے منظور ہے لیکن آپ جانتے ہیں کہ ہم پھر رو پڑیں گے۔ جونہی وہ میرے یہ الفاظ سنتے ان کی آنکھوں سے اسی وقت آنسو رواں ہو جاتے تھے۔ وہ دکھی دل سے کہتے: ''مجھے میری بیوی واپس لا دو یا کم از کم میری دلجوئی کرو ___ میرے بچے میرے اندر اس خلا کو پُر کر دو۔ کیا میں تمہیں پیار کر سکتا تھا؟ اگر تم صرف میرے بیٹے ہوتے۔''

میری والدہ کو کھونے کے چالیس سال بعد انہوں نے اپنی دوسری بیوی کے ہاتھوں میں اس حالت میں جان دی کہ اس وقت بھی ان کے ہونٹوں پر میری والدہ ہی کا نام اور دل میں ان کی تصویر نقش تھی۔

مجھے جنم دینے والے ایسے ہی تھے۔ قدرت نے انہیں جو کچھ عطا کیا ان میں سے میرے حصے میں ایک حساس دل آیا۔ جو چیز ان کے لیے خوش قسمتی کا باعث تھی وہی میری تمام بدقسمتیوں کا سبب بنی۔

میں دنیا میں زندگی کی بہت کم امید لیکر آیا اور انہیں بھی میرے بچنے کی امید بہت کم تھی۔ میں بچپن سے ہی ایک تکلیف میں مبتلا تھا، جو وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی ہی چلی گئی اور اگر وہ اب کسی وقت میری جان چھوڑ بھی دے تو بعد میں نا قابل برداشت تکلیف اُٹھانا پڑے گی۔ مجھے موت کے منہ سے نکالنے کا سہرا میرے والد کی ایک (سوتیلی) بہن کے سر تھا، جو بہت نیک اور خوش اخلاق ہیں انہوں نے میری خوب دیکھ بھال کی۔ وہ اب بھی حیات ہیں اور لگ بھگ چالیس برس کی ہیں اور نرسنگ کے شعبے سے وابستہ ہیں۔ ان کا خاوند اگرچہ ان سے کم عمر ہے لیکن کثرت شراب نوشی کی وجہ سے (ان سے) زائد عمر کے لگتے ہیں۔

میری پیاری خالہ! آپ نے مجھے بچایا، جس کے بدلے میں آپ کو صدق دل سے معاف کرتا ہوں لیکن مجھے افسوس ہے کہ اب جبکہ آپ کو میری ضرورت ہے، میں وہ محبت اور شفقت آپ کو دینے سے قاصر ہوں جو آپ نے اوائل عمری میں مجھے دی تھی۔ میری نرس بہن بھی زندہ اور صحت مند ہے۔ کاش وہ ہاتھ جنہوں نے میری آنکھوں کو اس دنیا کی روشنی دکھائی، وہ موت کے وقت انہیں بند بھی کر سکیں۔ تمام انسانوں میں یہ مشترک خاصیت ہے کہ وہ سوچنے سے پہلے تکلیف اُٹھاتے ہیں (لیکن) میں نے اپنے حصے سے زیادہ برداشت کیا ہے۔ مجھے اپنی زندگی کے ابتدائی پانچ چھ سالوں کا کچھ علم نہیں۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں نے کبھی (کچھ) سیکھنے کے لیے پڑھا ہو۔ البتہ مجھے اس سے ذہن پر پڑنے والے اثرات یاد ہیں اور اس لمحے کے بعد اپنے ساتھ بیتنے والی ہر بات کا علم ہے۔

ہر رات کھانے کے بعد ہم (میں اور میرے والد) رومانوی کہانیوں کی وہ کتاب پڑھتے تھے، جو میری ماں کے زیر مطالعہ رہتی تھی۔ میرے والد کا ارادہ صرف مجھے پڑھنے میں رواں کرنا تھا۔ چونکہ یہ ان کا خیال تھا لہٰذا اس مقصد کے لیے یہ کتاب موزوں تھی لیکن جلد ہی اس میں بیان کئے گئے واقعات اتنی دلچسپی اختیار کر گئے کہ ہم باری باری اسے تمام رات پڑھتے رہتے اور اسے ختم کیے بغیر ہمیں چین نہ آتا۔ کبھی کبھار تو صبح چڑیوں کے چہچہانے پر میرے والد (اپنی اس کمزوری پر) شرمندہ ہو کر کہتے "چلو اب سو جائیں، میں بھی تمہارے ساتھ بالکل بچہ بن گیا ہوں"۔

مطالعے کی اس عادت کی وجہ سے جلد ہی میں دوسری چیزیں بآسانی پڑھنے اور سمجھنے لگا اور ایسے جذبات سے آگاہ ہو گیا، جو میری عمر کے حساب سے غیر موزوں تھے۔ یوں سمجھیں جذبات (اور خیالات) کا ایک لامتناہی سلسلہ چل نکلا تھا اور میں یہ نہ جانتا تھا کہ ان کا تعلق درحقیقت کس چیز سے تھا۔ میرے لیے یہ سب نا قابل فہم تھا لیکن میں نے حقیقت کو محسوس ضرور کیا تھا (اس کے

باوجود)، جذبات کی یہ اُٹھان مجھے مستقبل میں غوروفکر سے نہ روک سکی۔انہوں نے میری زندگی کو ایک ایسا جذباتی رخ ضرور عطا کردیا، جو تجربہ اور غوروفکر بھی نہ مٹا سکا۔

رومانوی کہانیوں کے پڑھنے کا یہ سلسلہ 1719ء کے موسم گرما تک چلا لیکن اس کے بعد موسم سرما کچھ مختلف انداز میں گزرا۔ چونکہ اپنی والدہ کی لائبریری میں رکھی ہر چیز (کتاب) میں اور میرے والد پڑھ چکے تھے، سواب ہمارا دھیان ان کے والد (میرے نانا) کی لائبریری کی طرف گیا، جو مجھے ورثے میں ملی تھی۔ ہمیں وہاں سے کافی نادر کتابیں ملیں اور یہ اس لیے ایک انوکھی بات تھی کہ میرے نانا پادری تھے (اور ان کے لیے یہ عہدہ بالکل موزوں تھا) حالانکہ عام زندگی میں وہ ان میں درج باتوں کو ثانوی حیثیت دیتے تھے۔ مگر ہمیں ان کا حسن انتخاب دیکھ کر رشک آیا۔ نانا کے کتب خانے میں درج ذیل کتابیں نمایاں حیثیت کی حامل تھیں:

The history of the Church and Empire by Le Sueur,

Bossuett's Discourse on Universal History,

Plutarch's lives,

the History Venice by Nani,

Ovid's Metamorphoses,

La Bruyere,

Fontenelle's World, his dialogues of the Dead,

اور مولیئر کی چند جلدیں قابل ذکر ہیں۔

یہ سب کتابیں جلد ہی میرے والد کے کمرے میں منتقل ہوگئیں۔ روزانہ جب وہ اپنے کام میں مصروف ہوتے تھے میں ان کتابوں کو اس ذوق وشوق سے پڑھتا جو میری عمر کے لوگوں میں عام نہ تھا۔

مجھے افلاطون بہت پسند تھا۔ اسے بار بار پڑھنے سے میرے (اندر کے) رومانوی جذبات کو مزید جلا ملی۔ میں آگسی لاس، بروٹس، ارسٹائڈز کے بجائے آرٹی منس، آرنڈیٹس اور جیوبا کو پڑھنے پر ترجیح دیتا۔ یہ دلچسپ تحریریں اکثر والد کے ساتھ گفتگو کا موضوع بنتی رہتی تھیں۔ انہوں نے میرا جمہوریت اور آزادی سے لگاؤ اس قدر بڑھایا کہ میرا ذہن کسی کی روک ٹوک اور غلامی کو برداشت کرنے سے قطعاً منکر ہوگیا لیکن یہ میرے لیے کافی تکلیف دہ ثابت ہوا کیونکہ مجھے اکثر ایسے حالات کا سامنا کرنا پڑتا' جو ان جذبات سے بالکل میل نہ کھاتے تھے۔ میرا ذہن ہر وقت

روم اور یونان کے نامور سورماؤں کے بارے میں سوچتا رہتا۔

میرا بھائی مجھ سے سات سال بڑا تھا۔ اُس نے میرے والد کے پیشے کو اپنا ذریعہ معاش بنایا۔ مجھے بے پناہ پیار ملنے کی وجہ سے شاید وہ کچھ زیادہ نظر انداز ہو گیا تھا لیکن یہ کوئی قابل قبول وجہ نہ تھی۔ اسی وجہ سے اس کی تعلیم اور عادات پر بہت گہرا اثر پڑا اور وہ کم عمری میں ہی کسی کے کہنے میں نہ آتا تھا۔ میرے والد نے بہت کوشش کی کہ اُسے کسی کی شاگردی میں دے دیں لیکن اس سے بھی اس کی عادات واطوار میں کوئی فرق نہ پڑ سکا۔ اگرچہ میری اس سے ملاقات بہت کم ہوتی تھی اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ہم ایک دوسرے کو بہت اچھی طرح جانتے تھے لیکن میں اُسے بے حد محبت کرتا تھا اور مجھے یقین تھا کہ وہ بھی اپنے منتشر ذہن کے ساتھ مجھے اتنا ہی پیار کرتا ہوگا۔ مجھے یاد ہے جب ایک دن والد اُسے بُری طرح پیٹ رہے تھے تو میں ان دونوں کے بیچ حائل ہو گیا اور اپنے بھائی کے لیے ڈھال بن گیا۔ اسے بچانے کے لیے میں اس قدر جذباتی ہو گیا تھا کہ غالباً یا تو میرے آنسوؤں سے گھبرا کر یا مجھے تکلیف پہنچنے کے خیال سے میرے والد کا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا اور انہوں نے اس کی غلطی معاف کردی۔ میرے بھائی کا رویہ مسلسل خراب ہوتا گیا اور ایک دن وہ اچانک غائب ہو گیا۔ کچھ عرصے بعد ہمیں پتہ چلا کہ وہ جرمنی چلا گیا ہے مگر اس کے بعد ہمیں اس کی کوئی خبر نہ مل سکی لہٰذا میں والد کا اکلوتا سہارا رہ گیا۔

میرا معاملہ اپنے والد کی نسبت بالکل برعکس تھا کہ کسی بادشاہ کی اولاد کو بھی وہ پیار اور توجہ نہ ملی ہوگی جو بچپن میں میرے حصے میں آئی لیکن ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ اتنی توجہ پا کر کوئی بگڑنے سے بچ جائے۔ مجھے دوسرے بچوں کے ساتھ باہر کھیلنے کی اجازت نہ تھی۔ میں نے کبھی کسی سے وہ بیہودہ مذاق نہ کیے تھے جو ناقص تعلیم کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ مجھ میں وہ تمام خامیاں تھیں جو اس عمر کے بچوں میں عام تھیں۔ میں بہت باتونی اور غیر مہذب تھا اور کبھی کبھار جھوٹ بھی بولتا تھا۔ مٹھائی، پھل یا کوئی اور کھانے کی چیز چرانے سے میں نے کبھی انکار نہ کیا تھا لیکن میں نے کبھی شرارت (میں)، دوسروں پر الزام تراشی اور جانوروں کو نقصان پہنچانے کا مزہ نہ لیا تھا۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ ایک دن جب ہماری ہمسائی میڈم کلاٹ چرچ گئی ہوئی تھیں، تو میں نے ان کی دیگچی میں پانی گرم کیا جس کا خیال مجھے اب بھی مسکرانے پر مجبور کر دیتا ہے کیونکہ (اگرچہ وہ ایک اچھی خاتون تھیں) وہ ہر وقت اکتائی ہوئی اور شکائتیں کرتی رہتی تھی۔۔۔۔ میں نے۔۔۔ اپنے بچپن کی شرارتوں سے آپ کو مختصراً تعارف کروادیا ہے۔

میں بہت نرم دل واقع ہوا تھا کیونکہ میرے گرد دنیا کے چند اچھے اور رحم دل لوگ موجود

تھے۔ میرے والد، میری خالہ اور نرس، میرے رشتہ دار، دوست اور ہمسائے جس کسی سے بھی میرا تعلق تھا مجھ سے بہت پیار کرتا تھا اگرچہ میں ان کے تابع اور ماتحت نہ تھا' میں بھی ان سب سے بہت پیار کرتا تھا۔ بہت کم چیزیں میری خواہشات کو اکساتی تھیں اور مجھے اپنی خواہشات کا احساس کم ہی ہوتا تھا کیونکہ انہیں بہت کم رد کیا جاتا تھا۔ میں حلفیہ طور پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں اُس وقت تک تلون مزاجی سے نا آشنا رہا جب تک کہ مجھے ایک استاد سے اختیارات نہ سونپ دیے گئے۔

جو وقت اپنے والد کے ساتھ پڑھنے' لکھنے اور اپنی آیا میکولین کے ساتھ چہل قدمی کے بعد بچ جاتا، وہ میں اپنی خالہ کے ساتھ گزارتا۔ انہیں سلائی کڑھائی کرتے دیکھنا، گاتے ہوئے سنتا یا ان کے پاس بیٹھے رہنا، ان کی ہر بات مجھے خوش رکھتی۔ ان کی شخصیت نے میرے دل پر ایک ایسا نہ ختم ہونے والا اثر چھوڑا تھا کہ ان کی عادات اور رویہ اب بھی میری آنکھوں کے سامنے گھومتا رہتا ہے۔ مجھے اپنے (ان سے کیے گئے) پیار بھرے سوالات یاد ہیں یہاں تک کہ مجھے اُن کا لباس، سکارف اور وہ دو لٹیں' جو ان کے ماتھے پر ہر وقت جھولتی رہتی تھیں یہ اس وقت کا فیشن تھیں' بھی یاد ہیں۔

گو مجھے ایک عرصے تک اپنے موسیقی سے لگاؤ کے بارے میں علم نہ ہو سکا لیکن مجھے پورا یقین ہے کہ میری خالہ نے ہی میری توجہ اس جانب مبذول کرائی۔ انہیں بہت سے گانے یاد تھے جو وہ بہت سُریلے اور میٹھے انداز میں گاتی تھیں۔ ان کے اندر جو سکون اور زندہ دلی تھی وہ اُن کے اردگرد رہنے والوں کو بھی اداسی اور افسردگی سے بچائے رکھتی اور انہیں خوش و خرم رکھتی تھی۔

اُن کی آواز کا مجھ پر کچھ ایسا اثر تھا کہ مجھے اُن کے کئی گانے اب تک یاد ہیں بلکہ کچھ تو ایسے بھی ہیں جو بچپن سے مجھے کبھی یاد نہ آئے لیکن اب وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جب کبھی وہ مجھے یاد آتے ہیں تو مجھ پر ایک نا قابل بیان اثر چھوڑ جاتے ہیں۔ شاید کوئی اس بات پر یقین نہ کرے کہ مجھ جیسا (ایک) بوڑھا عمر رسیدہ انسان جو کمزوری اور اندیشوں سے تھک چکا ہے کبھی کبھار بچوں کی طرح بلک بلک کر رو کر خود کو حیران کر دیتا ہے اور اپنی اس بوڑھی شکایت بھری آواز میں وہ دھنیں گنگناتا ہے، جو کبھی بچپن میں میری پسندیدہ رہی تھیں۔ ان میں ایک گانا خاص تھا، جس کی دھن مجھے اب تک یاد ہے لیکن اُس کے آخری حصے کے الفاظ بارہا یاد کرنے پر بھی میرے ذہن میں نہیں آتے اگرچہ اس کے قافیے کا مجھے کچھ کچھ اندازہ ہے۔ اُس گانے کا آخری حصہ کچھ یوں تھا:

Tircis, je n'ose

Ecouter, ton chalumeau

Sous l' Ormeau;

Car on en cause

Un Berger s'engager

sans danger,

E t toujonrs l'epine est sous la rose

میری شدید خواہش تھی کہ میں یہ جان سکوں کہ اُسے یاد کرنے پر میرے دل پر ایسا جادو بھرا اثر کیوں ہوتا ہے لیکن میں اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔ مجھے بس اتنا معلوم ہے کہ جب بھی اس کے اختتام پر پہنچتا ہوں تو میری آواز بھرا جاتی ہے اور آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔ بارہا میں نے یہ ارادہ کیا کہ میں پیرس سے بذریعہ خط و کتابت اس گانے کا آخری حصہ منگوالوں کہ شاید کسی کو اس کا علم ہو۔ مجھے یہ بھی یقین ہے کہ اگر مجھے یہ پتہ چلا کہ میری خالہ سوسان کے علاوہ بھی کوئی اس کو گا تا رہا ہے تو میں یہ لطف اور سکون کھو بیٹھوں گا۔

سو میں نے اپنی زندگی کی ابتداء ان ہی جذبات سے کی۔ انہی جذبات کی بدولت میری زندگی میں تلخ اور شیریں جذبات کا ظہور ہوا، میری یہی خوبی بعد میں میرے لئے کئی مشکلات اور آسانی کا باعث بنی۔

میری تعلیم کا سلسلہ ایک حادثے سے متاثر ہوا جس کے اثرات میری بقیہ زندگی پر بھی پڑے۔ میرے والد کا ایک کم ظرف انسان سے جھگڑا ہو گیا جس میں اس کی ناک سے خون بہہ نکلا اور اُس نے بدلہ لینے کی خاطر میرے والد پر یہ الزام لگایا کہ انہوں نے بھرے شہر میں اس پر تلوار تان لی تھی۔ اس الزام کی وجہ سے میرے والد کو جیل بھیج دیا گیا۔ اُس وقت کے قانون کے مطابق انہوں نے مدعی کو بھی اپنے ساتھ سزا دینے پر اصرار کیا جس کی انہیں اجازت نہ مل سکی۔ اس پر انہوں نے اپنی عزت اور آزادی پر سودا نہ کرتے ہوئے اپنی مرضی سے تاعمر جلاوطنی اختیار کر لی۔

میں اپنے انکل برنارڈ سے تعلیم حاصل کرتا رہا، جو کہ اس وقت جنیوا کی قلعہ بندی پر مامور تھے۔ وہ اپنی بیٹی کو تو کھو چکے تھے لیکن ان کا ایک بیٹا تھا جو تقریباً میرا ہم عمر تھا اور ہم دونوں کو "باسی" مسٹر لیمبر سائر کے پاس رہنے بھیج دیا گیا، جہاں ہم لاطینی زبان سیکھنے کے علاوہ تعلیم کے نام پر مہمل چیزیں بھی پڑھتے رہے۔

یہاں میں نے دو سال گزارے اور اس عرصے میں میرے اندر کا آتش مزاج آدمی کسی حد تک ٹھنڈا ہو گیا اور میرا بچپن واپس آ گیا۔ جنیوا جہاں کوئی چیز قطعی نہ ہوتی تھی، میرا واحد پسندیدہ

مشغلہ کتابیں پڑھنا تھا، لیکن ''باسی'' میں مجھے زیادہ مصروفیت ہونا چاہیے تھی، مگر میرا بیشتر وقت کھیلنے کودنے میں گزرتا۔ یہ جگہ اتنی نئی اور دل لبھانے والی تھی کہ اس سے دل کے بھر جانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ میرے دل میں دیہاتی زندگی سے ایک لگاؤ پیدا ہو گیا جسے وقت بھی کم نہ کر سکا، نہ ہی میرا دل کبھی اس خوشی اور مسرت پر ملول ہوا جو میں نے بچپن میں یہاں پائی۔ اس کی یاد ساری زندگی میرے ساتھ رہی، یہاں تک کہ اس عمر میں بھی جب کہ میں پھر بچپن کی طرف لوٹ رہا ہوں۔

مسٹر لیمبر سائر ایک سمجھدار اور قابل انسان تھے۔ جو نہ ہماری تعلیم کا حرج ہونے دیتے تھے اور نہ ہی اسے ہمارے لیے بوجھ بناتے تھے۔ ان کے پڑھانے کا انداز اس لحاظ سے مجھے ٹھیک لگتا تھا کہ باوجود اس کے کہ میں کسی کی روک ٹوک برداشت نہ کر سکتا تھا، مگر وہ یادیں کبھی مجھ پر گراں نہیں گزریں۔ انہیں مجھے سمجھانے کے لیے زیادہ محنت نہ کرنا پڑتی۔

سادہ دیہاتی زندگی نے میرا دل سچی دوستی کے لیے کھول کر رکھ دیا تھا۔ اس موضوع پر میرے خیالات بہت اعلیٰ مگر فنا تھے۔ اس پرسکون ماحول میں رہنے کی عادت نے مجھے میرے کزن برنارڈ کے قریب کر دیا۔ لیکن میری محبت اپنے بھائی کے لیے زیادہ تھی جسے وقت بھی کبھی متاثر نہ کر سکا۔ وہ ایک لمبا، دبلا پتلا اور کمزور سا لڑکا تھا جس کا دماغ بھی اس کے جسم کی طرح کمزور تھا اور وہ اپنے بارے میں کی گئی طنزیہ باتوں کا بُرا نہ مناتا تھا...... ہماری پڑھائی، تفریح اور کام سب ایک سے تھے۔ چونکہ ہم دونوں ہی اکیلے تھے اس لیے ہمیں ایک ساتھی کی ضرورت تھی۔ ہمیں ایک دوسرے سے الگ کرنا ہمیں ختم کرنے کے مترادف تھا۔ گو ہم نے اپنے جذبات کا اظہار کبھی نہیں کیا تھا۔ لیکن یہ جذبہ بہت شدید تھا۔ ہمارے ذہن ایک دوسرے سے دور جانے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے تھے اور نہ ہی اسے قبول کرنے کو تیار تھے۔ اگر کوئی اختلافی بات نہ ہوتی تو ہم ایک دوسرے کی بات مان جایا کرتے تھے۔ اور ہمارے سرپرستوں میں سے اگر کسی کی اسے حمایت حاصل ہوتی تو اس کا فائدہ مجھے بھی پہنچتا تھا۔ اسی طرح ہماری (دوستی کے) رشتے میں توازن (برقرار) رہتا۔ اگر وہ اپنا کام کرنے میں ہچکچاتا تو میں اسے اس پر آمادہ کرتا۔ جب میرا کام مکمل ہو جاتا تو میں اُس کے کام میں اُس کی مدد کرتا۔ میں اپنے پھرتیلے پن کی وجہ سے ہمیشہ اُس سے آگے رہتا۔ مختصراً یہ کہ ہماری شخصیات میں اتنی مماثلت اور ہماری دوستی اس قدر پرخلوص تھی کہ ان پانچ سالوں میں جو ہم نے ''باسی'' اور جنیوا میں گزارے ہمیں جدا کرنا ممکن نہ تھا۔ یہ سچ ہے کہ ہم اکثر جھگڑتے بھی تھے لیکن ایسا موقع کبھی نہ آیا تھا کہ ہمیں ایک دوسرے سے جدا کیا گیا ہو۔ ہماری ناراضگی کبھی پندرہ منٹ سے زیادہ نہ رہتی تھی۔ ہم نے کبھی ایک دوسرے کی چغلی نہ کھائی

تھی۔ یہ کوئی ایسی خاص بات تو نہ تھی مگر ایسی مثال بچوں میں عام نہیں ہوتی۔

باسی میں، میں نے جس طرح اپنا وقت گزارا وہ میری طبیعت کے لیے اس قدر موزوں تھا کہ میری شخصیت کو سنوارنے کے لیے کچھ پُر امن، محبت بھری اور خیر خواہی پر مبنی مہلت درکار تھی۔ مجھ جیسا مغرور شخص دنیا میں اور کوئی نہ تھا۔ کبھی کبھار انسانی کوششوں کے بعد میرے ذہن میں اونچے اونچے خیالات آجاتے لیکن پھر مجھ پر افسردگی چھا جاتی۔ میری سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ میرا ہر جاننے والا مجھ سے محبت کرے۔ میں اور میرا کزن قدرتی طور پر معتدل طبیعت کے مالک تھے۔ ہمارے چاہنے والے بھی ایسے ہی تھے۔ میری طبیعت ہر اس چیز کی طرف مائل ہوتی تھی جو قدرت نے مجھے عطا کی تھی۔ مگر دو سالوں میں نہ ہی میں کسی ظلم/جبر کا شکار ہوا اور نہ اس کا حمایتی بنا۔

اگر کوئی مجھ سے یا اپنے اردگرد کے لوگوں سے مطمئن ہوتا تو اس سے زیادہ خوشی کی بات میرے لیے اور کوئی نہ ہوتی۔ چرچ میں پڑھائی کے دوران مجھے اس وقت بڑی کوفت ہوتی' جب مجھے کوئی بات دریافت کرنے سے پہلے مسز لیمبر سائر کی ناپسندیدگی کا مجبوراً سامنا کرنا پڑتا۔ یہ میرے لیے بہت تکلیف دہ بات ہوتی تھی۔ گو میں تعریف کا بھوکا نہ تھا لیکن میرے اندر اتنی انا ضرور تھی کہ میں ڈانٹ کھانے کی بجائے اسے ناراض کرنا بہتر نہ سمجھتا تھا اور میں وثوق سے یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ مس لیمبر سائر سے ڈانٹ کھانے کو میں انہیں بیزار کرنے پر ترجیح دیتا تھا۔

مس لیمبر سائر اور اُن کے بھائی بہت سخت طبیعت کے مالک تھے لیکن ان کی سختی شاید ہی بے وجہ ہوتی تھی۔ مجھے اُن کی سزا سے زیادہ اُن کی ناراضگی سے تکلیف پہنچتی تھی۔ یقیناً بچوں سے ایسے برتاؤ میں تبدیلی لائی جا سکتی ہے اور اس کے دوررس نتائج بھی ہوتے ہیں۔ میں خود کو مزید تفصیل سے جانے سے روک رہا ہوں۔ کیا میری اس مثال (جس سے ایک بڑی خرابی کی طرف اشارہ ملتا ہے) سے میری خاموشی کا پتہ نہیں چلتا؟

چونکہ مس لیمبر سائر کی (مجھ سے) محبت ایک ماں کی محبت جیسی تھی اس لیے وہ ایک ماں ہی کی طرح حکم بھی چلاتی تھیں۔ یہاں تک کہ جب ضرورت پڑتی وہ ہمیں (بچوں کی) سزائیں بھی دیتی تھیں۔ وہ ہمیں اکثر ڈراتی دھمکاتی بھی تھیں، جس سے مجھے بے حد خوف آتا تھا اگرچہ حقیقت اس سے کم تکلیف دہ ہوتی تھی۔ مجھے آج تک اس بات کی وجہ تو سمجھ نہ آسکی مگر اس سزا کا ایک اثر یہ ہوتا کہ سزا دینے والے سے میری محبت اور بڑھ جاتی تھی۔ یہ محبت اور میری طبعی نرمی مجھے سزا حاصل کرنے کے لیے مزید بہانے ڈھونڈنے پر اُکساتی تھی۔ میری ہوش میری شرم پر حاوی ہو

جاتی اور میری یہ خواہش میرے خوف پر حاوی ہوتی چلی گئی۔ مجھے مکمل یقین تھا کہ اگر ان کا بھائی مجھ سے ایسا ہی سلوک کرتا تو اُس کے نتائج قطعاً مختلف ہوتے لیکن اس جیسے انسان کے لیے ایسا کرنا ممکن نہ تھا۔ اگر میں باز رہا تو اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ میں مس لیمبر سائر کا دل نہ توڑنا چاہتا تھا کیونکہ خیر خواہی کا جذبہ ہمیشہ میرے دل پر اثر کرتا تھا۔

جو بھی ہوا اُس میں میرا کوئی ہاتھ نہ تھا گو میری خواہش تھی کہ ایسا ہو۔ میرا ضمیر اس پر مطمئن تھا اور ایسا آخری بار ہی ہوا تھا کیونکہ مس لیمبر سائر کے خیال کے مطابق اس سزا کا کوئی خاطر خواہ اثر نہ ہوا تھا۔ اُسے دہرانا چونکہ اُن کے بس میں نہ تھا اس لیے وہ اس سے دستبردار ہو گئیں تھیں۔ اب تک ہم اُن کے کمرے میں سوتے آئے تھے بلکہ سردیوں میں تو ہم ان کے ساتھ ہی ان کے بستر میں بھی سو جاتے تھے لیکن دو دن بعد ہمارا کمرہ الگ کر دیا گیا۔

کون یقین کرے گا کہ آٹھ سال کی عمر کے بچے کو ایک تیس سالہ عورت کی طرف سے دی گئی یہ سزا اس کے جذبات اور خواہشات پر ایسا گہرا اثر چھوڑے گی۔ لیکن یہ اثر ان کی امیدوں کے بالکل اُلٹ تھا کہ وہ بات جس سے میرے جذبات بھڑک اُٹھتے تھے' اب میرے لیے کوئی معنی نہ رکھتی تھی بلکہ اب تو میری جستجو ختم ہو چکی تھی۔ بچپن ہی سے میرے اندر ایک ہوس موجود تھی لیکن اس واقعے کے بعد میں بالکل نیک اور پارسا ہو گیا تھا۔ اس واقعے نے مجھ پر ایسا گہرا اثر چھوڑا کہ ایک مدت تک میں کسی خوبصورت عورت کو بس اطمینان سے دیکھتا رہتا اور اُسے دیکھ کر مجھے مس لیمبر سائر یاد آ جاتیں۔ یہاں تک کہ میں شادی کے قابل ہو گیا لیکن یہ واقعہ میرے ذہن سے نہ نکل سکا اور محرومیت کے احساس نے مجھے پاگل کر دیا۔

اگر انہیں مجھے سزا دینا مقصود تھا تو ان کا یہ مقصد پورا ہو گیا تھا۔ میری تینوں خالائیں بہت دور اندیش تھیں۔ یہ سچ ہے کہ میرے والد بہت شوقین مزاج تھے لیکن وہ پرانے زمانے سے تعلق رکھتے تھے۔ مس لیمبر سائر کے پاس ایک بہت اچھا ملازم تھا، جو انہوں نے اس بات پر نکال دیا کہ اُس نے ہمارے سامنے کوئی ناشائستہ بات کر دی تھی۔ مجھے فحش لوگوں سے بہت نفرت تھی اور میں انہیں بہت حقیر خیال کرتا تھا لیکن اس حقارت میں ایک خوف بھی شامل ہوتا تھا۔ نفس پرستی سے مجھے اتنی نفرت تھی کہ ایک بار میرا گزر "پیلٹ سکونز" میں سڑک کے کنارے ایک گڑھے کے پاس سے ہوا اور مجھے بتایا گیا کہ اس جگہ لوگ مباشرت کرتے ہیں۔ میں جب بھی اس کے بارے میں سوچتا تو میرے ذہن میں فوراً کتے آ جاتے جنھیں میں نے اسی حالت میں دیکھا تھا۔ سچ پوچھیں تو یہ سوچ کر مجھے کراہت محسوس ہونے لگتی تھی۔

تعلیم کے یہ تعصبات جو کسی بھی مشتعل طبیعت کو دھیما کر سکتے تھے، میرے اندر مضبوط تر ہوتے گئے اور ایسا میری نفس پرستی کی وجہ سے تھا۔ میں اپنے نفس کو مطمئن کرنے کے لیے اس ذریعے کا سہارا لیتا تھا، جسے میں جان چکا تھا۔ مجھے اس لیے زیادہ کی چاہ نہ تھی۔ نہ ہی میں نے کوئی اور ذریعہ اپنایا تھا اور نہ اپنانے کا خیال دل میں آیا۔ اپنے بے قابو خیالات کی وجہ سے جب مجھ پر جنون سوار ہو جاتا تو میں خیالوں میں صنف نازک سے مدد لیتا تھا۔

اس جذباتی طبیعت کے ساتھ میں نے بلوغت کی عمر پار کی۔ اپنے جذبات کی تسکین کے لیے میں مس لیمبر سائر کے بے خیالی میں دیے گئے مقصد کے علاوہ کوئی طریقہ نہ جانتا تھا اور نہ ہی جاننے کی خواہش رکھتا تھا۔ میری عمر جب کچھ بڑھی تو یہ بچگانہ شوق کم ہونے کی بجائے ایک ایسی چیز سے وابستہ ہو گیا جسے میں اپنے جذبات سے علیحدہ نہ کر سکتا تھا۔ میری حماقت اور میری فطری بزدلی مل کر مجھے اس خواہش کے قریب ہونے سے روکے رکھتیں۔ جنھیں میں پسند کرتا تھا، ان کے سامنے میں اپنی خواہش کا اظہار نہ کر سکا اور خاموشی اور کمزوری سے اپنا وقت گزارتا رہا۔

محبوبہ کے قدموں میں پڑے رہنا' اُس کے حکم بجالانا اور اس سے معافی طلب کرنا، مجھے بے حد خوشی دیتا تھا۔ ان خیالات سے جس قدر میرا خون جوش مارتا میں اُسی قدر عاشق مزاج ہوتا جاتا تھا۔

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اظہار محبت کا یہ طریقہ نہ تو کسی کو کوئی فائدہ دیتا ہے اور نہ ہی نقصان۔ یہ خیال ہی سہی مجھے کبھی کبھار اس میں کامیابی بھی حاصل ہو جاتی تھی۔ سو میرے کمزور اور رومان پسند دماغ اور زندگی نے میرے اخلاق اور جذبات کو خراب ہونے سے بچالیا جو مجھے بے راہ روی کی طرف لے جا رہے تھے۔

یہ میرا ___ اپنے سنجیدہ اعترافات کی طرف پہلا لیکن مشکل ترین قدم ہے۔ ہمیں ایک ایک غلط بات بیان کرتے وقت جو کراہت محسوس ہوتی ہے، وہ کسی بیہودہ بات سے زیادہ ہوتی ہے۔ مجھے اپنے ارادے پر مکمل یقین ہے۔ میں نے جو بات بتانے کا فیصلہ کیا ہے، اُس سے مجھے کوئی نہیں روک سکتا۔ میں جب یہ اعلان کروں گا کہ مجھے تمام عمر اپنی حماقت قبول کرنے کی جرأت نہ ہو سکی تو اس سے پیدا ہونے والی مشکلات کا مجھے بخوبی اندازہ ہے لیکن میرا دماغ اُلجھا ہی رہا اور میں جذبات کی رو میں بہتا چلا گیا.... وہ واحد چیز جو مجھے مل نہ سکی مجھے ہمیشہ اس کی طلب رہی۔

ایسا میری پوری زندگی میں ایک ہی بار ہوا اور اُس کی رائے بھی میری ایک ہم عمر لڑکی نے دی تھی۔

یوں اپنے وجود کی تلاش میں میں نے کچھ ایسے عناصر دریافت کیے جو بظاہر تو متضاد تھے لیکن وہ مل کر ایک یکساں اثر چھوڑتے تھے۔ کچھ ایسے عناصر بھی تھے جو ایک جیسے تھے لیکن حالات کی وجہ سے کچھ ایسا مختلف اثر چھوڑتے تھے کہ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ ان میں کوئی مماثلت تھی۔ کون یقین کرے گا کہ میری زندگی کا چشمہ وہاں سے پھوٹ رہا تھا جہاں سے عیش وعشرت اور آرام میری زندگی کا حصہ بن گئے تھے۔ اس سے پہلے کہ میں اس موضوع کو ختم کروں، میں ایک ایسا واقعہ بیان کرتا ہوں جس سے اس بات کی اہمیت واضح ہو جائے گی۔

ایک دن جب میں باورچی خانے سے ملحقہ کمرے میں پڑھ رہا تھا تو نوکرانی نے مس لیمبر سائر کی کچھ کنگھیاں سکھانے کی خاطر آگ کے پاس رکھیں۔ کچھ دیر بعد جب وہ انہیں اُٹھانے آئی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ اُن میں سے کچھ کے دندانے ٹوٹے ہوئے تھے۔ ایسی شرارت کون کرسکتا تھا میرے علاوہ وہاں کوئی نہ آیا تھا، اس لیے مجھ سے پوچھ گچھ کی گئی جس سے میں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ مس لیمبر سائر نے مجھے مشورہ دیا، نصیحت کی اور دھمکایا پر اس کا مجھ پہ کوئی اثر نہ ہوا۔ میں مسلسل انکار کرتا رہا۔ گو یہ اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ تھا کہ مجھ پر پہلی بار جھوٹ بولنے کا شک کیا گیا تھا لیکن تمام شواہد اس قدر ٹھوس تھے کہ میرا احتجاج کچھ کام نہ آیا۔ اس معاملے کو نہایت سنجیدگی سے لیا گیا۔ شرارت، جھوٹ اور ڈھٹائی —— یہ تمام چیزیں سزا دیئے جانے کے قابل تھیں اور اس بار سزا مس لیمبر سائر نے نہ دینا تھی۔ میرے انکل بونر کو خط لکھ کر بلایا گیا اور میرے معصوم چچا زاد کو (اس شرارت میں) برابر کا شریک ٹھہرایا گیا۔ ہمیں ایک جیسی اور سخت سزا دی گئی۔ اس بات کا مثبت پہلو یہ نکلا کہ میرے بُرے عزائم ہمیشہ کے لیے دب گئے اور اس (مقصد) کے لیے اُن کے پاس اس سے اچھا طریقہ اور کوئی نہ تھا۔ میں اپنے قارئین کو یقین دلاتا ہوں کہ میں ایک طویل عرصے تک ان کے اثر سے آزاد رہا۔

لیکن اس سختی کا خاطر خواہ نتیجہ نہ برآمد ہو سکا اس لیے اپنی ڈھٹائی کی وجہ سے مجھے بار بار یہ سختی برداشت کرنا پڑی اور میری حالت قابل رحم ہو گئی تھی لیکن میں اپنی بات پر قائم رہا۔ میں غلطی قبول کرنے پر موت کو ترجیح دیتا تھا۔ کسی بچے پر زیادہ دیر سختی کا مقصد اُسے شیطان سے دور کرنا ہوتا ہے کیونکہ میری خرابی کو یہی دیا گیا تھا۔ میں اس خوفناک آزمائش سے بری حالت میں رہا لیکن بالآخر کامیاب ٹھہرا۔ اس واقعے کو پچاس برس بیت چکے ہیں اور اب سزا کا کوئی خوف باقی نہیں رہا لیکن میں حلفیہ طور پر اب بھی یہی کہتا ہوں کہ میں بے گناہ تھا اور کنگھی کو چھونا اور توڑنا تو درکنار میں آگ کے قریب بھی نہ گیا تھا۔ یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ پھر یہ شرارت کس نے کی؟ مجھے اس کا کوئی اندازہ

نہیں، میں صرف یہ جانتا ہوں کہ میں بے گناہ تھا۔

اس سے آپ کے ذہن میں ایک ایسا کردار آئے گا جو زیر تربیت اور کمزور تھا لیکن اپنے جذبات میں مغرور، پر جوش اور نا قابل تسخیر تھا۔ ایک ایسا بچہ جس کے ساتھ نرمی اور انصاف کا سلوک برتا جاتا تھا اور جس کا بے انصافی سے کبھی پالا نہ پڑا تھا۔۔۔ اور اب اُسے اُن لوگوں کے ہاتھوں کہ جن کی وہ بے حد عزت کرتا تھا اور ان سے پیار کرتا تھا' اِس کو (ناانصافی) کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ میرے اس چھوٹے سے وجود کے لیے خیالات کی یہ کیسی گمراہی تھی؟ میں یہ کہتا ہوں کہ اگر کسی کے لیے ممکن ہے تو خود کو میری جگہ رکھ کر دیکھئے کیونکہ میں یہ بتانے سے قاصر ہوں کہ اس وقت میرے ذہن پر کیا بیتی تھی۔

میرا ذہن ابھی اتنا پختہ نہ ہوا تھا کہ خود کو دوسروں کی جگہ رکھ کر سوچ سکتا اور یہ فیصلہ کر سکتا کہ شواہد کس قدر میرے خلاف تھے۔ مجھ پر اس سزا کا خوف طاری تھا، جو اُس جرم کی پاداش میں مجھے دی جا رہی تھی جو میں نے کیا ہی نہ تھا لیکن مجھے اُس سے جو تکلیف پہنچی وہ میری بے عزتی، دکھ اور افسوس کے سامنے کوئی معنی نہ رکھتی تھی۔ میرا کزن جو تقریباً ایسے ہی حالات کا شکار تھا اور اپنے ناکردہ گناہ کی سزا بھگت رہا تھا وہ یوں شرمندہ تھا جیسے یہ سب اُس نے سوچ سمجھ کر کیا ہو۔ وہ میری حالت دیکھ کر برہم ہوتا تھا۔ ہم دونوں اکٹھے سوتے تھے اور ایک دوسرے کو اتنی سختی سے بھینچ لیتے کہ ہمارا سانس رکنے لگتا۔ جب ہم کچھ پر سکون ہوتے تو اپنا غصہ نکالنے کے لیے اُٹھ بیٹھتے اور اپنی پوری طاقت کے ساتھ حیوان، جانور، اور جلاد کے الفاظ دہرانے لگتے....!

اب بھی جبکہ میں یہ سب لکھ رہا ہوں تو مجھے اپنی دھڑکنیں تیز ہوتی محسوس ہو رہی ہیں۔ اگر میں ہزار برس بھی زندہ رہوں تو میرے ذہن میں وہ اُلجھن ہمیشہ زندہ رہے گی۔ ظلم اور زیادتی کا یہ واقعہ میری روح پر ایک ایسا گہرا اثر چھوڑ گیا ہے کہ ایسا کوئی بھی واقعہ میرے زخم کو تازہ کر دیتا ہے۔ (اس وقت) اگرچہ اس بے عزتی کا نشانہ میں ہی تھا لیکن اس کا اثر اس قدر شدید تھا کہ اگر میں اپنے جذبات کو ایک طرف بھی رکھ دوں تو بھی ایسا کوئی واقعہ چاہے وہ کسی کے ساتھ بھی ہو رہا ہو میرے دل کو دکھی کر دے گا اور مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ سب کچھ میرے ساتھ ہو رہا ہو۔ اگر میں کسی ظالم حکمران کی تاریخ پڑھوں یا کسی مکار پادری کی مثنوی کے بارے میں سنوں تو میرا دل چاہتا ہے کہ میں انہیں اسی وقت ختم کر دوں اگرچہ اس سے مجھے خود بھی نقصان پہنچ سکتا ہے۔

میں اکثر جانوروں (مرغ، کتا، گائے یا کوئی اور جانور جو دوسروں کو نقصان پہنچا رہا ہو) کے پیچھے بھاگتا ہوں یا میں نے انہیں پتھر مار کر بھگا دیتا ہوں کیونکہ (میری دانست میں) انھیں احساس

تھا کہ وہ دوسرے سے زیادہ طاقتور ہیں۔ میرے لیے یہ ایک فطری بات ہے اور میں اسے ماننے پر مجبور ہوں۔ میرے ساتھ ہونے والی پہلی زیادتی کا زخم اتنا گہرا ہے کہ بھلائے نہیں بھولتا۔

اس واقعے نے میرے بچپن کا سکون چھین لیا اور اس کے بعد میں کبھی خوشی کو اچھی طرح محسوس نہ کر سکا۔ جب میں اپنے بچپن کے واقعات کو ذہن میں لاتا ہوں تو ایسا لگتا ہے کہ میری خوشیاں اس واقعے کی نذر ہو گئی تھیں۔ اس (واقعے) کے بعد ہم چند مہینے ہی "باسی" میں رہے اور بظاہر یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے ہمارے آباؤاجداد (آدم اور حوا) نے جنت میں اپنی معصومیت کھو دی ہو، ہمارے ساتھ بھی ویسا ہی ہوا ہو لیکن حقیقت اس سے بالکل مختلف تھی۔

اب تو ہم پر محبت، عزت، دوستی اور اعتبار جیسے احساسات کا کوئی اثر نہ ہوتا تھا جو شاگردوں کو اپنے استاد کے قریب کرتے ہیں۔ اب ہم انہیں ایسے دیوتا کا درجہ نہ دیتے تھے، جو دل کا حال پڑھ لیتا ہے۔ ہمیں غلطی کرنے پر شرمندگی سے زیادہ سزا دیئے جانے کا خوف رہتا تھا۔ ہم نے مکر کرنا، جھوٹ بولنا اور بغاوت کرنا سیکھ لیا تھا۔ ان تمام برائیوں نے ہماری معصومیت کو خراب اور ہماری تفریح کو تلخ بنا دیا تھا۔ وہ علاقہ جو اپنی خوبصورتی اور سادگی کی وجہ سے ہمارا دل موہ لیتا تھا، اب ہمیں ویران صحرا کی طرح لگتا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس کی خوبصورتی پر پردہ ڈال دیا گیا ہو۔ اب ہم اپنے باغیچوں اور پھولوں پر بھی کوئی توجہ نہ دیتے تھے اور اپنے لگائے ہوئے پودوں کو دیکھ کر ہمیں کوئی خوشی نہ محسوس ہوتی تھی۔ ہم اپنے آپ سے متنفر تھے اور ہمارے اساتذہ ہم سے بیزار۔ مختصراً یہ کہ میرے انکل نے ہمیں (بالآخر) واپس بلا لیا اور ہم بغیر کسی افسوس کے مسٹر اینڈ مسز لیمبر سائر کو چھوڑ کر چلے آئے۔

مجھے 'باسی' چھوڑے قریباً تیس سال ہونے کو آئے ہیں اور مجھے ایک بار بھی اُس کے بارے میں سوچ کر سکون حاصل نہیں ہوا لیکن زندگی کا ایک اہم حصہ گزارنے کے بعد اب جب میں بڑھاپے میں قدم رکھ رہا ہوں (اور حالیہ واقعات بھی مجھے زیادہ دیر تک یاد نہیں رہتے) مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ یادیں میرے دل پر کچھ اس طرح نقش ہیں کہ میں اپنی زندگی کی بجھتی ہوئی شمع کو روز اُن سے روشن کرتا ہوں۔ اس وقت ملنے والی معمولی سے معمولی بات بھی مجھے خوشی دیتی ہے اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ اُس وقت سے تعلق رکھتی ہے۔ مجھے اُس جگہ، اُس وقت اور اُن لوگوں کی تمام باتیں یاد ہیں۔ مجھے کمروں میں نوکر کام کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ چڑیا کھڑکی میں بیٹھی نظر آتی ہے اور سبق یاد کرتے ہوئے مکھی کا تنگ کرنا بھی یاد ہے۔ مجھے اس گھر کا سارا نقشہ یاد ہے جس میں سیدھے ہاتھ پر مس لیمبر سائر کا کمرہ تھا اور اُس میں تمام پادریوں کے گروپ کی

ایک تصویر تھی۔ ایک بادپیا، ایک بڑی سی تصویر، گھر کی کھڑکیاں (جو باغ میں کھلتی تھیں) من پر رس بھری کے درخت کا سایہ پڑتا تھا اور اس کی شاخیں اکثر کھڑکی کے راستے اندر داخل ہو جاتی تھیں۔ مجھے معلوم ہے کہ قاری کو ان سب باتوں کا علم نہیں ہو سکتا مگر مجھے ایسا لگتا ہے کہ یہ سب بتانا ضروری ہے۔ مجھے یہ تمام چھوٹے چھوٹے واقعات پھر سے یاد کرنے کی اجازت کیوں نہیں دیتے؟ جبکہ انہیں یاد کر کے میں اب بھی خوشی محسوس کر سکتا ہوں۔ ان میں سے پانچ یا چھ (واقعات) قابل ذکر ہیں۔ چلیں ہم مل کر یہ معاملہ طے کر لیتے ہیں اگر میں پانچ کا ذکر نہ بھی کروں تو مجھے ایک ــــــ صرف ایک (کو بیان کرنے) کی اجازت ہونی چاہیے۔ شرط صرف یہ ہے کہ میں اسے تفصیلاً بیان کر سکوں تاکہ میرے دل کو تسکین مل سکے۔

اگر آپ کی پسند کو مدنظر رکھوں تو وہ واقعہ بیان کروں گا، جب مس لیمبر سائر بدقسمتی سے اس وقت چراہ گاہ میں گر پڑیں جب سارڈینیا کا بادشاہ وہاں سے گزر رہا تھا اور ان کی کمر ننگی ہو گئی ــــــ لیکن میرے لیے اخروٹ کے درخت کا وہ واقعہ زیادہ اہمیت رکھتا تھا کیونکہ اس میں میری حیثیت ایک کردار کی تھی جبکہ پہلے واقعے میں، میں صرف ایک تماشائی تھا۔ میں دعویٰ کر سکتا ہوں کہ میں نے جو دیکھا اس میں ہنسنے کی کوئی بات نہ تھی لیکن اس پر ہنسا جا سکتا تھا۔ اس واقعے نے مجھے ایک ایسی شخصیت کے لیے خبردار کر دیا تھا جسے میں ایک ماں یا (شاید) اس سے بھی زیادہ محبت کرتا تھا۔

اے میرے پُر اشتیاق قارئین! یقیناً تمہارا تجسس اس درخت کی کہانی سننے کے لیے تمہیں بے چین کر رہا ہو گا تو سنو اور اس (مصیبت) کو سن کر خوفزدہ نہ ہونا۔

برآمدے کے دروازے کے باہر، بائیں طرف، ایک چبوترہ تھا۔ وہ اکثر وہاں رات کے کھانے کے بعد بیٹھتے تھے لیکن دن کے وقت یہ سورج کے سامنے ہونے کی وجہ سے تکلیف دیتا تھا۔ اس سے بچنے کی خاطر مسٹر لیمبر سائر نے اخروٹ کا ایک درخت وہاں لگا دیا تھا اور اس واقعے کو بہت اہمیت دی گئی۔ درخت لگانے کے بعد جب مٹی برابر کی جا رہی تھی تو دونوں نے (درخت کو) ایک ایک ہاتھ سے تھام رکھا تھا اور گانے گا کر خوشی کا اظہار کیا جا رہا تھا۔ اسے صحیح طرح پانی دینے کے لیے انہوں نے اس کی جڑوں کے قریب ایک گڑھا سا بنا دیا تھا۔ میں اور میرا کزن ہر روز پانی دینے کا یہ پُرجوش مظاہرہ دیکھا کرتے تھے اور قدرتی طور پر یہ سمجھنے لگ گئے تھے کہ زیادہ اچھا کام درخت لگانا ہے اور ہم نے یہ نیک کام کسی سے کہے بغیر اپنے ذمے لے لیا۔

اس کوشش میں ہم نے بیر کے درخت کا ایک حصہ کاٹ کر چبوترے کے پاس اخروٹ کے اُس شاہانہ درخت سے آٹھ دس فٹ دور لگا دیا۔ ہم اس کے گرد ایک گڑھا بنانا بھی نہ بھولے لیکن

مشکل یہ تھی کہ (اسے سینچنے کے لیے) پانی کہاں سے لایا جائے کیونکہ وہ بہت دور سے لایا جاتا تھا اور اس کی ہمیں اجازت نہ تھی لیکن پانی چونکہ ہمارے پودے کے لیے ضروری تھا سو ہم نے اُسے حاصل کرنے کے لیے ہر طرح کے چکر چلائے۔

کچھ دنوں تک ہر کام صحیح ہوتا رہا اور جلد ہی (ہمارے پودے کو) پتے لگنے لگے جن کی ہم ہر گھنٹے کے بعد پیائش کرتے۔ ہمیں یقین تھا (گو ابھی ہمارا پودا زمین سے ایک فٹ ہی بلند ہوا تھا کہ) جلد ہی یہ ہمیں فرحت بخش لمحات فراہم کرنے لگے گا۔ اس بدقسمت پودے کے پیچھے ہم نے اپنا بہت سا وقت برباد کیا اور ہم اپنی پڑھائی پر بھی پوری توجہ نہ دے سکے۔ ہماری بے توجہی کی وجہ نہ جانتے ہوئے بھی ہمیں پہلے سے بھی زیادہ قریب رکھا جاتا۔ آخر وہ دن آ گیا کہ جب ہمارے پودے کو پانی نہ مل سکا۔ ہمیں یہ سوچ کر ہی تکلیف ہو رہی تھی کہ ہمارا لگایا ہوا پودا پانی نہ ملنے کی وجہ سے مُرجھا جائے گا ــــ ضرورت ــــ ایجاد کی ماں ہے ــــ سو ہمیں ایک ترکیب سوجھی ــــ کہ جس کے ذریعے ہم پودے کو خراب اور خود کو پریشان ہونے سے بچا سکتے تھے۔ وہ طریقہ یہ تھا کہ اخروٹ کے (اُس) درخت سے لے کر ہمارے (بیر کے) پودے تک زیرِ زمین ایک نالی بنائی جائے تاکہ اخروٹ کو ملنے والے پانی کا کچھ حصہ ہمارے پودے کو بھی میسر ہو سکے۔ یہ کام ہم نے بڑے جوش کے ساتھ سرانجام دیا لیکن ہمیں اس میں فوری کامیابی نہ حاصل ہو سکی جس کی وجہ شاید ہماری منصوبہ بندی میں کچھ کمی تھی کیونکہ پانی کا بہاؤ مسلسل نہ تھا جبکہ بیچ میں مٹی بھی آ جاتی تھی لیکن ہم دل برداشتہ نہ ہوئے۔ ''محنت سے ہر مشکل کا حل نکالا جا سکتا ہے'' اس پر عمل کرتے ہوئے ہم نے گڑھا اور گہرا کر دیا تاکہ پانی زیادہ گہرائی تک جا سکے۔ ہم نے پانی کا بہاؤ مسلسل رکھنے کے لیے لکڑی کے تختے بنائے۔ ایک ٹکڑا نیچے اور دو اُس کے اطراف میں اس طرح لگائے کہ ایک تکونی راستہ بن گیا۔ ہم نے اخروٹ کے درخت کے پاس ایک بڑا سا جنگلہ بنایا تاکہ مٹی اور پتھر پانی کو نہ روک سکیں۔ ان سب کو ہم نے نرم مٹی سے ڈھانپ دیا۔ اس کے بعد ہم امید اور خوف سے پانی دینے کے وقت کا انتظار کرنے لگے۔ انتظار کی لمبی گھڑیوں کے بعد وہ لمحہ آیا مسٹر لیمبر سائر کی طرح اس کام میں، ہم بھی اُن کے ساتھ تھے۔ ہم بھی سازش کر کے ایسی جگہ کھڑے ہو گئے جہاں سے وہ ہمارے درخت کو نہ دیکھ سکیں۔ خوش قسمتی سے انھوں نے اس کی طرف کمر کر رکھی تھی۔ جیسے ہی انھوں نے پانی دینا شروع کیا تو ہمیں یہ محسوس ہوا کہ وہ ہمارے درخت کی طرف رواں ہے اور ہم احتیاط کا دامن چھوڑ کر خوشی سے اچھلنے لگے۔ اچانک یہ شور سن کر مسٹر لیمبر سائر مڑے اگرچہ وہ اس وقت بہت انہماک سے اخروٹ کے گرد مٹی کو پانی جذب کرتے دیکھ رہے تھے۔ وہ یہ دیکھ کر حیران

ہوئے کہ پانی ہماری بنائی ہوئی نالیوں میں جا رہا تھا۔ اب چلانے کی باری اُن کی تھی۔ جب انہیں اصلیت کا پتہ چلا تو انہوں نے ایک کلہاڑی منگوائی اور ایک ہی وار میں لکڑی کے تختوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے اور وہ چلا رہے تھے اور نالی! اوہ نالی! اُن کی ضربیں زور پکڑتی گئیں اور اُن کی ہر ضرب ہمارے دل پر لگتی رہی۔ ایک ہی لمحے میں تختے، نالی، گڑھا یہاں تک کہ ہمارا (بیر کا) پودا سب برباد ہو گئے۔ اُس دوران اُن کی چیخوں کے علاوہ اور کسی نے کچھ کہا نہ سنا۔ وہ نالی' نالی! چیختے رہے اور ہماری امیدوں کو خاک میں ملاتے رہے۔

آپ شاید یہ سمجھے ہوں گے کہ اس واقعے کے بعد یہ ننھے معمار شاید مزید افسردہ ہوئے ہوں گے لیکن ایسا نہ تھا اور یہ کہانی یہیں ختم ہو گئی۔ مسٹر لیمبر سائر نے اس معاملے پر ہم سے کوئی بات نہ کی اور نہ ہی غصے کا اظہار کیا بلکہ ایک بار تو ہم نے انہیں یہ واقعہ بڑے مزے سے مس لیمبر سائر کی بہن کو سناتے ہوئے سنا اور اُن کے قہقہوں کی آواز دور تک سنائی دے رہی تھی لیکن ہمارے لیے جو بات سب سے زیادہ حیران کن تھی، وہ یہ کہ شروع میں تو ہمیں (اس ساری بات کا) بہت افسوس ہوا لیکن بعد میں یہ واقعہ ہمارے لیے غیر اہم ہو گیا تھا۔ ہم نے ایک دوسری جگہ پر (نیا) پودا لگایا۔ پہلے کا حشر کبھی کبھار یاد آتا تھا خاص طور سے نالی! نالی! کی وہ آوازیں یاد آتی تھیں۔ ہاتھ سے نالی بنانا، ایک ہرے بھرے درخت کے مقابلے میں ایک چھوٹا سا پودا لگانا میرے لیے فخر کی بات تھی۔ میرے ذہن میں اُس عمر میں بھی اس کی ایک ایسی وجہ تھی جو سیزر کو تیس (۳۰) برس کی عمر میں بھی نہ سوجھی ہوگی۔

اخروٹ کا درخت اور اُس سے جڑے تمام چھوٹے چھوٹے واقعات میرے ذہن میں اُسی طرح محفوظ اور واضح ہیں۔ اُس کے لیے ہم نے جو منصوبہ بندی کی تھی اُس کے بارے میں سوچ کر مجھے ہمیشہ ذہنی سکون حاصل ہوتا ہے۔ 1754ء میں جب میں جنیوا کے دورے پر تھا اور 'باسی' بھی گیا تو اپنے بچپن کی شرارتیں ___ خاص طور پر اس درخت کو یاد کرتا رہا (جس کی عمر اُس وقت تک تقریباً ایک تہائی صدی کے برابر ہوتی)۔ یادوں کے ہجوم میں، میں ایسا گھرا کہ مجھے اپنا وہ کارنامہ یاد کر کے خوش ہونے کے لیے ایک لمحہ بھی نہ مل سکا۔ اب وہاں اُس کی کوئی نشانی شاید ہی مل سکے لیکن اگر میں دوبارہ اپنی اُس پسندیدہ جگہ پر گیا تو مجھے یقین ہے کہ میں اُسے اپنے آنسوؤں سے سیراب کروں گا۔

جنیوا واپس آنے کے بعد میں اپنے انکل کے پاس دو یا تین سال رہا۔ مجھے امید تھی کہ میرے دوستوں کے ارادے میرے مستقبل پر اثر انداز نہ ہوں گے۔ میرا کزن چونکہ انجینئرنگ

میں دلچسپی رکھتا تھا سو وہ ڈرائنگ بھی سیکھ رہا تھا جبکہ وہ اپنے والد سے حساب بھی پڑھتا تھا۔ میں نے بھی اس میں شامل ہونے کی کوشش کی لیکن میں خاص طور پر ڈرائنگ کا شوقین تھا۔ اس تمام عرصے میں وہ سب میرے بارے میں تذبذب کا شکار تھے کہ مجھے گھڑی ساز بنایا جائے یا وکیل یا پھر پادری۔ میں شاید پادری بننے کو ترجیح دیتا کیونکہ (لوگوں کو) وعظ کرنا مجھے بہت دلچسپ لگتا تھا لیکن میری ماں کی معمولی آمدنی جو مجھ میں اور میرے بھائی میں تقسیم ہوتی تھی، میری پڑھائی کا خرچہ نہ اُٹھا سکتی تھی۔ میری عمر چونکہ اُس وقت کم تھی، اس لیے اس معاملے کو اتنی اہمیت نہ دی گئی اور میں اپنے انکل کے پاس ہی اپنا وقت گزارتا رہا جس میں بہتری بہت کم آسکی۔ میں اپنی رہائش کا خرچہ (جو کہ زیادہ مگر معقول تھا) بھی ادا کرتا رہا۔

میرے انکل بھی میرے والد کی طرح شوقین مزاج تھے لیکن انہیں میرے والد کی طرح اپنے شوق اپنے بچوں کی تعلیم کی خاطر قربان کرنے نہ آئے تھے۔ اس کے نتیجے میں ہماری پڑھائی متاثر ہوئی۔ میری خالہ ایک زاہدہ عابدہ خاتون تھیں اور انہیں ہماری بہتری سے زیادہ حمد یہ گیت گانے کا شوق تھا۔ ان سب باتوں کی وجہ سے ہم اکیلے رہ گئے لیکن ہم نے کبھی اس کا ناجائز فائدہ نہ اُٹھایا۔

ہمیں جُدا کرنا آسان نہ تھا اور ہم ایک دوسرے کی زندگی تھے۔ ہمیں اپنے ہم عمر دوسرے بگڑے ہوئے بچوں سے مل کر بالکل مزہ نہ آتا تھا۔ اگرچہ ہم فارغ رہتے تھے لیکن ہم نے آوارگی نہ سیکھی تھی۔ شاید اپنی اور اپنے کزن کی فراغت کا یہ ذکر صحیح نہ ہوگا کیونکہ ایسا بہت کم ہوتا تھا کہ ہم فارغ ہوں۔ سب سے اچھی بات یہ تھی کہ ہم اپنی تفریح میں اس طرح مسلسل مصروف رہتے تھے کہ ہمارا کبھی گلیوں میں وقت گزارنے کو دل نہ کرتا تھا۔ ہم پنجرے، پائپ، پتنگیں، ڈھول، گھر، کشتیاں اور غلیل بناتے رہتے اور اپنے پیارے دادا جی کے اوزار استعمال کر کے اُسی جیسی گھڑیاں بنانے کی بھی کوشش کرتے۔ ہمارا سب سے من پسند مشغلہ ڈرائنگ کر کے، دھو کر اور رنگ بھر کے کاغذ ضائع کرنا تھا۔ ایک بار جنیوا میں گیمبر کوٹا نامی ایک شعبدہ باز آیا جو پتلیوں کا تماشہ کرتا تھا، جسے ہم ایک آدھ بار دیکھنے بھی گئے لیکن دوبارہ جانے کا موقع نہ مل سکا کیونکہ ہم اکثر خود پتلیاں بنانے میں مگن رہتے تھے۔ ہم خود ہی ان کے کھیل بناتے اور پھر اُن پتلیوں کو اس میں شامل کرتے۔ ہم Punch کی بھونڈی آواز کی نقل بھی اتارتے۔ تماشائیوں کی کمی میرے پیارے انکل اور آنٹی پوری کر دیتے۔ وہ ہمارے تماشوں کو تحمل سے دیکھ اور سن لیتے تھے لیکن ایک دن میرے انکل نے اپنے خاندان کے بارے میں (لکھا ہوا) ایک مفصل مقالہ پڑھا اور اُس کے بعد ہم نے پتلی تماشے چھوڑ کر وعظ ترتیب دینے شروع کر دیئے۔

مجھے اعتراف ہے کہ ان تفاصیل میں دلچسپی کا کوئی عنصر نہیں ہے لیکن اِن سے اتنا ضرور پتہ چلتا ہے کہ ہماری تعلیم کا ابتدائی حصہ خوش اسلوبی سے انجام پایا تھا کیونکہ اس عمر میں جب ہمارے پاس وقت کی کمی نہ تھی ہم نے کبھی اس کا غلط استعمال نہ کیا تھا۔ ہمیں مزید دوستوں کی ضرورت بھی محسوس نہ ہوتی تھی اور ہم اکثر انہیں تلاش نہ کر پاتے۔ اکٹھے چہل قدمی کے دوران ہم اُن کی حرکتیں دیکھتے لیکن اُن میں شامل ہونے کی کوئی کوشش نہ کرتے تھے۔ ہمارے دل (ایک دوسرے کی) دوستی سے اس قدر سرشار اور ایک دوسرے کی قربت سے اتنے مطمئن تھے کہ ایک ساتھ معمول کی تفریح کرنا بھی ہمارے لیے کافی ہوتا تھا۔

جلد ہی ہمیں غیر منقسم سمجھا جانے لگا۔ جو بات ہمیں دوسروں سے ممتاز کرتی تھی وہ میرے کزن کا لمبا اور میرا نہایت چھوٹا قد تھا، اس لیے ہم دوسروں سے نرالے ہی نظر آتے تھے۔ اس کا لاغر جسم، زرد خدوخال، بوجھل سانسیں اور سست چال بچوں کو اس کی طرف متوجہ کر دیتی جو (مقامی زبان میں) اُسے Barna Bredanna کہہ کر پکارتے تھے۔ جیسے ہی ہم گھر سے باہر قدم رکھتے ہر طرف سے Barna Bredanna کی آوازیں سنائی دینے لگتیں۔ وہ اس بے عزتی کو تحمل سے برداشت کرتا لیکن میں فوراً اُن (بچوں) سے اُلجھ جاتا اور یہی اُن بدمعاش بچوں کا مقصد ہوتا تھا۔ میں جلد ہی ہارنے لگتا اور میرا کزن بے چارہ میری مدد کرنے کی کوشش کرتا لیکن اپنی کمزوری کی وجہ سے ایک ہی وار میں چت ہو جاتا۔ اس پر مجھے بہت غصہ آتا اور اس چکر میں مجھے وہ چوٹیں بھی سہنا پڑتیں جن کا اصل ہدف Barna Bredanna ہوتا۔ اس جھگڑے سے حالات مزید خراب ہو جاتے تھے اس لیے ہم صرف اس وقت باہر نکل سکتے تھے جب وہ سب سکول میں ہوتے۔

میں ہر وقت دکھوں کا مداوا کرتا رہتا تھا اور اب صرف ایک ایسی خاتون کی کمی تھی، جسے ایک مہم جو انسان کی ضرورت ہو اور یہ کمی بھی جلد ہی پوری ہو گئی۔ میرے پاس انتخاب کے لیے دو راستے تھے ــــ میں اکثر اپنے والد سے ملنے 'نیون' جاتا رہتا تھا جو کہ Vandois کا ایک چھوٹا سا شہر تھا۔ وہ اب وہیں مقیم تھے۔ ہر کوئی اُن کی عزت کرتا تھا اور اس کا اثر مجھ پر بھی تھا۔ میرے ان دوروں کے دوران سب سے بڑا مسئلہ یہ ہوتا تھا کہ کون مجھ سے زیادہ محبت کا اظہار کرتا ہے۔ ان میں سے ایک میڈم وولسن تھی، جو مجھے بہت چومتی تھی اور باقی کی کسر اُن کی بیٹی مجھے اپنا عاشق بنا کر پوری کر دیتی تھی۔ مجھے یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ گیارہ سال کا لڑکا ایک بائیس سالہ خاتون کے لیے کس طرح کا عاشق ثابت ہو سکتا ہے۔ (ان ہوشیار) خواتین کو پتلیاں نچانے کا فن بہت اچھا آتا تھا اور وہ اس کے ذریعے دوسری چیزوں پر پردہ ڈال لیتی تھیں۔ مجھے اپنے اور مس وولسن

کے درمیان کوئی فرق نظر نہ آتا تھا اور اس کے التفات نے مجھے تھوڑا مغرور بھی کر دیا تھا۔ میرا دل بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ میرا دماغ اُس میں پوری طرح ملوث ہوگیا تھا کیونکہ اس کا کوئی انجام نہ تھا۔ اگرچہ میری حالت روز بروز ابتر ہوتی جارہی تھی اور اکثر ایسے حالات پیدا ہوجاتے تھے کہ کوئی سنجیدہ سے سنجیدہ انسان بھی اُن پر قہقہے لگا سکتا تھا۔

میں نے دو قسم کی محبت دیکھی ہے اور وہ دونوں ہی سچی تھیں۔ لیکن ان دونوں میں شاید ہی کوئی تعلق تھا۔ یہ دونوں دوستی سے قطعاً مختلف تھیں میری پوری زندگی ان محبتوں میں بٹی ہوئی ہے۔ میں نے اکثر ایک ہی وقت میں ان دونوں کی کشش محسوس کی ہے۔ مثلاً جب میں کھلے عام اور زبردستی مس وولسن کو اپنا کہتا تھا تو میں کسی دوسرے کا اُس سے بات کرنا بھی برداشت نہ کرسکتا تھا۔ میرا ایک مختصر لیکن جذباتی تعلق مس گوٹن کے ساتھ بھی تھا، جسے میرے ساتھ (سکول کی) استانی جیسا سلوک روا رکھنا اچھا لگتا تھا۔ ہماری ملاقاتیں گو بالکل بچگانہ ہوتی تھیں لیکن مجھے ان سے بے حد سکون اور خوشی حاصل ہوتی تھی۔ مجھے ان ملاقاتوں کو خفیہ رکھنے کا مزہ آتا اور اس طرح میں مس وولسن کے ساتھ اُس وقت بے حد نرمی سے پیش آتا جب اس کی بہت کم امید ہوتی تھی۔ وہ مجھ سے اپنے معاشقے چھپاتی تھی لیکن جلد ہی یہ راز کھل گیا جس کا مجھے بے حد افسوس ہے۔ اس کے نتیجے میں مجھے اپنی نوجوان استانی کو چھوڑنا پڑا!!

مس گوٹن اصل میں بہت نرالی اور معزز خاتون تھی اگرچہ وہ بہت خوبصورت تو نہ تھی لیکن اس کے خدوخال میں کچھ ایسی بات تھی جو آسانی سے بھلائی نہیں جاسکتی۔ مجھے اس کا پختہ یقین ہے کہ اسے کوئی پاگل بڈھا بھی نہیں بھلا سکتا تھا۔ اس کی آنکھیں کچھ خاص تھیں۔ اس کی آنکھیں اس کی عمر اور شکل وصورت دونوں سے مطابقت نہ رکھتی تھیں۔ اس میں ایک تمکنت تھی جو اس کے کردار سے ہم آہنگ تھی لیکن اس میں جو بات سب سے مختلف تھی وہ یہ کہ وہ بیک وقت آزاد خیال اور اپنے رویے میں محتاط تھی اور عام طور پر یہ دونوں صفات ایک کردار میں اکٹھی نہیں ہوتیں۔ اگرچہ وہ مجھ سے بہت بے تکلف رہتی تھی لیکن مجھے کچھ ایسا ویسا کرنے کی اجازت کبھی نہ دیتی تھی۔ وہ مجھ سے ایسے پیش آتی جیسے میں ایک بچہ تھا، جس نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ وہ شاید خود کو بڑا سمجھنے لگی تھی یا پھر اس میں اس قدر پختگی تھی کہ وہ مجھے ہماری اس حماقت سے پیدا ہونے والے خطرے سے بچانا چاہتی تھی۔

میں ان دونوں کے جال میں ایسا پھنسا کہ جب ایک کے پاس ہوتا تو دوسری کے بارے میں خیال بھی نہ آتا۔ ان دونوں کے مجھ پر بالکل مختلف اثرات تھے۔ میں مس وولسن کے ساتھ اپنی

پوری زندگی گزار سکتا تھا اور مجھے اسے چھوڑنے کی خواہش بھی کبھی پیدا نہ ہوتی۔ میں ایک طرح سے اُس کے حسن کا دیوانہ ہو چکا تھا۔ اس کی حاضر جوابی اور خوش مزاجی، اس کا نظر اُٹھا کر مجھے دیکھنا، یہاں تک کہ اس کی ایک جھلک بھی مجھے اُس سے قریب کرتی تھی۔ میں اپنے رقیبوں کی نسبت زیادہ توجہ پا کر پھولا نہ سماتا تھا۔ تعریف، حمایت اور مسکراہٹ میری خوشی میں مزید اضافہ کرتی۔ تماشائیوں کے ہجوم میں مجھے محبت کا شدید احساس ہوتا اور میں جذباتی ہو جاتا۔ تنہائی میں میں متفکر اور اداس ہو جاتا۔ اگر مس وولسن بیمار ہوتی تو میں بھی اتنی ہی تکلیف محسوس کرتا۔ میں اسے ٹھیک کرنے کے لیے اپنی زندگی بھی دے سکتا تھا (اور غور کیجئے، مجھے تجربے کی بنا پر اس کی وجہ بھی معلوم ہے) اگر وہ مجھ سے دور ہوتی تو میرے خیالوں میں بسی رہتی۔ مجھے اس کی ضرورت شدت سے محسوس ہوتی۔ جب وہ میرے قریب ہوتی تو مجھے اس شدت سے پیار کرتی کہ میں بے خود ہو جاتا۔ میرے لیے یہ سوچنا بھی ناممکن تھا کہ میرے اور اُس کے درمیان جو رشتہ تھا وہ کسی اور کے ساتھ بھی ایسا رشتہ رکھ سکتی تھی۔ میں اُسے ایک بھائی کی طرح محبت کرتا تھا لیکن اُس کے لیے کسی عاشق کی طرح جلن محسوس کرتا تھا۔

مس گوٹن کے ساتھ یہ جذبہ ایک شدت اختیار کر گیا تھا اگرچہ مجھے یہ خیال تھا کہ مس ڈلسن سے ملنے والی خوشی میں بے سکونی کے جذبات کا کوئی عمل دخل نہ ہو گا لیکن مس گوٹن کو دیکھتے ہی میں پاگل ہو جاتا تھا۔ میری تمام حسیات جاگ جاتی۔ مجھے یقین تھا کہ اس کے ساتھ زیادہ دیر رہنا ناممکن تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ میری تیز دھڑکنوں سے میرا دم گھٹ جائے گا۔ مجھے ان دونوں کو دکھ پہنچانے کا ہر وقت اندیشہ رہتا۔ ایک کے ساتھ میں زیادہ خوش اور زندہ دل رہتا تو دوسری کے ساتھ فرمانبردار۔ میں مس وولسن کو دکھ پہنچانے کا سوچ بھی نہ سکتا تھا لیکن اگر مس گوٹن مجھے آگ میں چھلانگ لگانے کا بھی کہتی تو میں فوراً اُس کے حکم کی تعمیل کرتا۔ اس کی یا شاید ہم دونوں کی خوش قسمتی سے ہمارا یہ معاشقہ زیادہ دیر نہ چل سکا اور ویسے تو میرا اور مس وولسن کا معاملہ کم خطرناک تھا لیکن اگر کچھ دیر اور چلتا تو یہ بھی مصیبت کا باعث ہوتا۔ محبت کا انجام کبھی اچھا نہیں ہوتا، سوائے اس کے کہ اُس میں جذبائیت کے ساتھ رومان بھی شامل ہو۔

مس وولسن سے میرے تعلقات اتنے شوخ تو نہ تھے لیکن اس میں جذبات کا عمل دخل زیادہ تھا۔ ہم ہمیشہ ایک دوسرے کو آنسوؤں کے ساتھ رخصت کرتے۔ مجھے اپنے اندر ایک ایسا خلا محسوس ہوتا تھا کہ جس کے بارے میں سوچنا بھی دشوار ہوتا۔ میں اُسی کے بارے میں سوچتا اور باتیں کرتا۔ یہ جذباتی سنجیدگی کم نہ ہوتی تھی اگرچہ میرا خیال ہے کہ اس جذباتیت کا مرکز صرف وہ

ہی نہ تھی کیونکہ جب آپ کی تفریح کا سامان آپ سے چھین لیا جائے تو آپ اس جذباتیت کا ایک حصہ بن جاتے ہیں ـــــــ (اگرچہ مجھے اس بات کا اُس وقت علم نہ تھا)۔

جدائی کے لمحے آسان کرنے کے لیے ہم نے خط و کتابت کا سہارا لیا۔ان خطوط میں جو خود سوز اسلوب بیان استعمال ہوتا تھا، وہ کسی پتھر کو بھی موم کر سکتا تھا۔مختصراً مجھے فخر ہے کہ وہ میری جدائی کو برداشت نہ کر سکی اور مجھے ملنے جنیوا چلی آئی۔

میرا دماغ اب بالکل خراب ہو چکا تھا۔دو دن جو اُس نے یہاں گزارے میں ہواؤں میں ہی رہا۔اس کے رخصت ہونے کے وقت مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میں اس کے پیچھے پانی میں چھلانگ لگا دوں گا اور رو رو کر آسمان سر پر اُٹھا لوں گا۔اس سے اگلے ہفتے اس نے مجھے مٹھائی، دستانے وغیرہ بھیجے اگر مجھے اُسی لمحے اس کی شادی کی خبر نہ مل گئی ہوتی تو یقیناً یہ میرے لیے خوشی کا موقع ہوتا۔اور وہ سفر جس کو میں اپنے لیے اعجاز خیال کرتا تھا جبکہ اس کے سفر کا مقصد صرف اپنے لیے شادی کا جوڑا خریدنا تھا۔

میری بے عزتی کا آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں اور میں اس کو بیان کرنے کی کوشش نہیں کروں گا۔اس (بہادرانہ) کوشش میں، میں نے اس بے وفا (لڑکی) سے کبھی نہ ملنے کا فیصلہ یہ سوچ کر کیا کہ یہ اس کے لیے سب سے بڑی سزا ہوگی۔اس کے بیس برس بعد جب میں اپنے والد سے ملنے گیا اور جھیل کے پاس بیٹھا تھا تو میں نے اُن سے پوچھا کہ ہمارے پاس کھڑی کشتی میں بیٹھی خواتین کون ہیں۔میرے والد نے مسکراتے ہوئے جواب دیا کہ کیا تمہیں تمہارے دل نے نہیں بتایا؟ یہ تمہاری محبت میڈم جسٹین اور تمہارے لیے وہی مس ولسن ہے۔میں وہ نام سن کر چونک گیا جسے میں تقریباً بھلا چکا تھا۔پھر میں نے ملاح کو فوراً کشتی موڑنے کا کہا۔یہ انتقام لینے کا موقع مناسب نہ تھا کیونکہ میں چالیس سال کی ایک عورت سے بیس سالہ پرانا جھگڑا تازہ کر کے اپنی قسم توڑنا نہ چاہتا تھا۔

اس سے قبل کہ میرے مستقبل کا فیصلہ کیا جاتا کیا میں نے اپنی جوانی کے قیمتی لمحات ضائع نہیں کر دیئے؟ میرے قدرتی رجحان کے بارے میں کافی سوچ بچار کے بعد انھوں نے مجھ سے اس طرح جان چھڑائی جو اُن کے شایان شان نہ تھی۔مجھے شہر کے رجسٹرار (مسٹر میسرن) کے پاس بھیج دیا گیا تاکہ میں (بقول اپنے انکل برنارڈ کے) کباڑیے کا کام سیکھ سکوں۔مجھے اس نام سے ناقابل بیان تکلیف ہوتی تھی اور یہ حقیر کام کر کے پیسہ جمع کرنے سے بالکل اطمینان نہ حاصل ہونا تھا۔سخت محنت اور محکومیت نے مجھے (اس پیشے سے) مزید متنفر کر دیا تھا اور میں کبھی بھی دفتر میں بغیر

خوف کے داخل نہ ہوتا تھا جو دن بدن بڑھتا ہی جاتا تھا۔

مسٹر میسرن میری قابلیت سے اتنے ہی خوش تھے جتنا میں اپنے کام سے تھا ـــــ جبھی تو وہ مجھ سے حقارت سے پیش آتے اور مجھے مسلسل ملامت کرتے رہتے۔ وہ مجھے بے عقل اور احمق سمجھتے تھے۔ وہ بار بار یہ یاد دلاتے کہ میرے انکل نے اُنھیں یقین دلایا تھا کہ میں یہ کام جانتا ہوں لیکن اُنہیں مجھ میں کچھ نظر نہ آتا تھا اور یہ کہ انھوں نے اُس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اُسے ایک خوش مزاج لڑکا دیں گے، اصل میں انھوں نے ایک بے وقوف لڑکا پلے باندھ دیا تھا۔ غرضیکہ مجھے دفتر سے نکال دیا گیا اور مسٹر میسرن کے تمام ملازمین نے مجھے ایک ایسا بے وقوف سمجھ کر، جو صرف ایک ہی کام کر سکتا ہے ـــــ میری بے عزتی میں اضافہ کیا۔

میرے پیشے کا پھر سے انتخاب کر کے مجھے کسی گھڑی ساز کے بجائے ایک نقش نگار والے کے پاس بلکہ ایک اُجڈ کے ہاں ملازم رکھوا دیا گیا۔ میں رجسٹرار سے اس قدر ذلیل ہو چکا تھا کہ بغیر کسی حیل وحجت کے 'ہاں' کر دی۔ میرا مالک مسٹر ڈیوکامن جو بہت سخت اور اجڈ انسان تھا، جلد از جلد میری بچگانہ حرکات /عادات کو ختم کرنا چاہتا تھا۔ وہ میری فطری طور پر زندہ دل طبیعت کو ختم کر کے مکمل طور پر اپنا ملازم بنانا چاہتا تھا۔ میں اطالوی زبان، تاریخ ـــــ سب کچھ بھول چکا تھا۔ میں یہ بھی بھول گیا تھا کہ رومن نسل بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ میں جب اپنے والد سے ملنے گیا تو انہیں اپنا پیارا بیٹا ـــــ کہیں نظر نہ آیا اور نہ ہی خواتین کے لئے اپنا عاشق مزاج جین جیکوئس۔ مجھے کامل یقین تھا کہ مسٹر اینڈ مس لیمبر سائر بھی اپنے شاگرد کو نہ پہچان پائیں گے لہٰذا میں اُن سے دور دور ہی رہا۔ اس کے بعد میں نے انہیں نہیں دیکھا۔ چھوٹی چھوٹی خواہشات، کام اور تفریح ـــــ ہر بات مجھے اُن کی یاد دلاتی تھی۔ اپنی اچھی تعلیم کے باوجود مجھ میں ذلیل ہونے کی خاصیت پائی جاتی تھی، ورنہ یہ زوال اتنی آسانی اور تیزی سے نہیں آسکتا تھا۔

میرا کام اتنا بُرا نہ تھا اور ڈرائنگ کا میں ویسے ہی بے حد شوقین تھا۔ نقش نگاری کے کام میں کوئی بُرائی بھی نہ تھی اور نہ ہی اس میں ماہر بننے کے لیے کوئی خاص قابلیت درکار تھی۔ لیکن مجھے امید تھی کہ میں اس میں ماہر ہو جاؤں گا۔ میں شاید اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہو جاتا اگر مجھ پر بے وجہ پابندیاں نہ ہوتیں۔ میرے مالک کی روک ٹوک نے مجھے کام سے متنفر کر دیا تھا۔ میں نے اُس کا وقت ضائع کیا جبکہ میں تمغے بنایا کرتا تھا اور میں یہ کام تفریحاً کیا کرتا تھا۔

بدقسمتی سے میرے مالک نے مجھے اس خلاف قانون کام میں پکڑ لیا جس کے نتیجے میں مجھے سخت مار پڑی۔ اس کے ساتھ اس نے مجھ پر جعلی سکے بنانے کا الزام بھی لگایا کیونکہ میں جو تمغے

بناتا تھا اس پر ملک کا نشان بھی تھا جبکہ میں حلفیہ طور پر کہتا ہوں کہ مجھے جعلی تو کیا اصل سکوں کا بھی علم نہ تھا، ویسے بھی مجھے مقامی سکوں سے زیادہ رومن سکوں کے بارے میں زیادہ علم تھا۔

میرے مالک کی سختی نے مجھے محنت کرنے سے روکے رکھا، جو میں عام حالات میں ضرور کرتا۔ بلکہ مجھ پر کی گئی سختی نے مجھے ایسے کاموں پر مجبور کیا جو میں عام طور پر ناپسند کرتا ہوں جیسے جھوٹ بولنا، آرام طلبی اور چوری کرنا۔ اس سے پہلے کبھی مجھ پر اولاد اور غلامی میں فرق اتنا واضح نہ ہوا تھا۔ یہ فرق مجھ پر اس عرصے میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں کی وجہ سے واضح ہوا۔ اب تک میرے پاس کسی حد تک آزادی تھی، جو میں نے اچانک کھودی۔ اپنے والد کے پاس میں منچلا، مس لیمبر سائر کے ہاں میں آزاد اور اپنے انکل کے گھر میں محتاط انسان تھا لیکن اپنے مالک کے پاس میں خوفزدہ سا رہتا تھا۔ اس لمحے کے بعد میرا دماغ بگڑنا شروع ہو گیا۔ میں نے ہمیشہ ہر چیز میں اچھائی دیکھی تھی جس میں میرا حصہ نہ ہوتا تھا' جو خوشی میں نہ دیکھ سکتا تھا، جو چیز میں کھا نہ سکتا تھا، اُسے دیکھنے کی مجھے اجازت نہ تھی، وہ جذبہ جس کا اظہار مجھے نہ کرنا چاہیے تھا اُس کے بارے میں مجھے محتاط ہونا پڑتا تھا۔ کبھی مجھے اپنی تمام خواہشات کا اظہار کرنے کی اجازت تھی ___ لیکن اب کیا تبدیلی آ گئی تھی؟ اپنے مالک کے پاس مجھے بولنے کی اجازت نہ تھی۔ یہ ایسے ہی تھا کہ جیسے مجھے کسی چیز کے کھانے کا بہت شوق ہے لیکن میں اسے چکھے بغیر اٹھ جاؤں۔ جس کمرے میں میرا کوئی کام نہ ہوتا وہاں سے مجھے نکلنا پڑتا۔ میں مسلسل اپنے کام میں مگن رہتا۔ جو آزادی میرے مالک اور اُس کے ساتھیوں کے پاس تھی، وہ مجھے میری غلامی کا مزید احساس دلاتی۔ اگر کوئی جھگڑا ہو جاتا تو باوجود اس کے کہ مجھے حالات کا اُن سے زیادہ علم ہوتا میں اپنی زبان نہ کھول سکتا تھا۔ مختصراً یہ کہ میں جو (چیز) بھی دیکھتا وہ میری خواہش بن جاتی اور اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ مجھے اُس کا مزہ لینے کی اجازت نہ تھی۔ بےفکری، آسانی اور وہ تمام دوسری چیزیں جن (کو کرنے) کے باوجود پہلے میری غلطیوں کو نظر انداز کر دیا جاتا تھا، میں اُن سب کو الوداع کہہ چکا تھا۔ اب میں خوشی سے وہ واقعہ یاد کرتا ہوں جو اُس وقت پیش آیا تھا، جب میں اپنے والد کے پاس تھا اور جسے یاد کر کے اب بھی میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ جاتی ہے۔ (واقعہ کچھ یوں تھا کہ) کسی غلطی کی وجہ سے مجھے کھانا کھائے بغیر سونے کے لیے بھیج دیا گیا۔ میں ہاتھ میں روٹی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا لیے کچن سے گزر رہا تھا کہ میں نے سیخ پر گوشت پکتے دیکھا۔ میرے والد اور باقی لوگ آگ کے گرد بیٹھے تھے۔ مجھے ہر ایک کے آگے سے گزرنے کے لیے اُن کے آگے جھکنا پڑتا۔ یہ کرتے ہوئے میں للچائی نظروں سے گوشت کو بھی دیکھ رہا تھا، جو اپنی خوشبو کی وجہ سے میری اشتہا بڑھا رہا تھا۔ میں خود کو اُس

(گوشت) کے آگے جھکنے سے بھی نہ روک سکا جبکہ وہ مجھے مل نہ سکتا تھا۔ میری اس (بغیر سوچے سمجھے کی گئی) شرارت نے سب کو ہنسنے پر مجبور کر دیا اور مجھے وہاں بیٹھنے اور کھانے کی اجازت دے دی گئی۔ ایسی کوئی حرکت شاید میں اپنے مالک کے پاس بھی کرتا لیکن اوّل تو وہاں مجھے اس کا خیال نہ آتا دوسرا مجھے اس پر عمل کرنے کی ہمت نہ ہوتی۔

غرضیکہ میں نے ہر چیز کی خواہش کرنا، مکر کرنا، جھوٹ بولنا اور چوری کرنا (جس کا مجھے پہلے کبھی خیال نہ آیا تھا) کرنا بھی سیکھ لیا، گو اب تک مجھے یہ باتیں کھل کر بیان کرنے کی ہمت نہ ہوئی تھی۔ میری خواہشوں اور کمزوریوں نے مجھ میں چوری کی عادت ڈال دی تھی۔ یہی بات اور شاگردوں میں چوری کی عادت کا سبب بنتی ہے یعنی شاگرد جب بڑے ہو کر یہ دیکھتے ہیں کہ وہ حکم دے کر ہر کام کروا سکتے تب ان میں یہ شرمناک عادت ختم ہو جاتی ہے۔ مجھے چونکہ ایسا کوئی تجربہ نہ تھا، اس لیے میری یہ عادت ٹھیک نہ ہو سکی۔

بچوں کے اچھے جذبات اگر پنپ نہ سکیں تو ان میں برائیاں پیدا کر دیتے ہیں۔ میں اپنی خواہشات پر قابو نہ رکھ سکا اور کھانے کی چیزیوں میں ایک سال تک چوری کرتا رہا۔ میری پہلی چوری کی وجہ کسی کو خوش کرنا تھا۔

میرے مالک کے پاس ایک 'ویرات' نامی ملازم تھا، جس کی ماں اس کے پاس ہی رہتی تھی۔ اُس نے گھر سے کافی دور ایک باغ بنا رکھا تھا۔ اس باغ میں شاندار پھل لگتے تھے۔ ویرات کے پاس بہت کم پیسے ہوتے تھے۔ اُس نے یہ سوچا کہ جب باغ میں پھل لگیں گے، تو وہ اُن کو توڑ کر بازار میں فروخت کر دے گا اور اس طرح اپنی وہ تمام خواہشات پوری کر لے گا' جو وہ عام طور پر پوری نہ کر سکتا تھا۔ چونکہ وہ بہت زیادہ چالاک نہ تھا، اس لیے اُس نے اس بات کو راز میں نہ رکھا۔ پہلے تو وہ کچھ دیر میری خوشامد کرتا رہا' جس کا مقصد مجھے سمجھ نہ آیا۔ پھر اس نے مجھے یہ کہہ کر اپنا منصوبہ بتایا کہ یہ اِسی لمحے اُس کے ذہن میں آیا ہے۔ پہلے تو میں نے اُس کی بات سننے سے ہی انکار کر دیا لیکن اس کے مسلسل اصرار کے بعد میں نے اس کے سامنے ہتھیار ڈال دیے کہ خوشامد ویسے ہی میری کمزوری ہے!

اس نیک کام کو کرنے کے لیے میں روزانہ باغ کی کانٹ چھانٹ کر کے اُسے سنوارتا اور وہاں سے بہترین پھل اکٹھے کر کے 'موتارڈ' کے بازار میں لے جاتا۔ وہاں کچھ نیک اور بوڑھی خواتین (جنھیں شاید یہ علم ہو چکا تھا کہ میں وہ پھل کہاں سے لے کر آتا ہوں) ان کی قیمت گھٹانے کی کوشش کرتیں، وہ اپنے شک کا کھلے عام اظہار کرتی تھیں اور اس کا مجھ پر وہی اثر ہوتا جو

وہ چاہتی تھیں۔ میں پریشان ہو کر ان کی مقرر کی ہوئی قیمت پر وہ پھل فروخت کر آتا۔ جب میں پیسے لے کر مسٹر ویرات' کے ہاں جاتا، تو وہ اور اُس کا دوست ان پیسوں سے شاندار ناشتہ کرتے۔ اس سارے کام میں محنت اگرچہ میری ہوتی تھی مگر مجھے اس میں شامل نہ کیا جاتا اور میں ایک معمولی سی رشوت پر ٹرخا دیا جاتا۔

میں یہ بدمعاشی بہت وفاداری سے کرتا اور اپنے مالک کو خوش کرنے کی پوری کوشش کرتا۔ جب کافی دن گزر گئے تو مجھے یہ خیال آیا کہ کیوں نہ میں اپنے مالک سے چوری کروں اور اس (مسٹر ویرات) آمدنی میں سے دسواں حصہ چرا لوں۔ مجھے ان کاموں سے پیدا ہونے والے خطرے کا کوئی ڈر نہ ہوتا تھا۔ اس کے نتیجے میں مجھے گالیوں کی بوچھاڑ کے علاوہ سخت جھاڑ پڑ سکتی تھی کیونکہ اصل مجرم جو تمام فائدہ اُٹھا رہا تھا، اپنے جرم سے صاف مکر سکتا تھا اور میری سزا اُس کے الزام سے دوگنی بھی ہو سکتی تھی جبکہ میں صرف ایک ادنیٰ سا ملازم تھا۔ اُس (کاریگر) کے مقابلے میں میری بات کسی صورت قابل قبول نہ ہوتی۔ غرضیکہ یوں بدنیت لوگ ہر حالت میں خود کو بچا کر کمزور لوگوں کو پھنسا دیتے ہیں۔

اس کے بعد مجھے احساس ہوا کہ چوری کرنا اتنا بُرا کام نہ تھا جتنا میں اُسے سمجھتا تھا۔ میں نے اس حقیقت کو اپنے لیے ہر قسم کا فائدہ (جو میرے بس میں تھا) اُٹھانے کے لیے استعمال کیا۔

ایسا نہیں تھا کہ مجھے اپنے مالک کے پاس کھانے کو کچھ نہ ملتا تھا لیکن میرے لیے اپنے نفس پر ضبط کرنا اُس وقت دشوار ہو جاتا جب میں اُنھیں عیش کرتے دیکھتا۔ جب بہترین چیز کھانے کے لیے میز پر لگائی جا رہی ہو، اُس وقت بچوں کو میز سے اُٹھنے پر مجبور کرنے کی عادت اُن کی خواہش کو مزید بڑھا دیتی ہے اور ان کو چوری کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ شاید اس معاملے میں مجھے دقیانوس سمجھا جائے۔ بہرحال میری شرارت کامیاب رہی لیکن جب میں پکڑا گیا تو نتیجہ بالکل اُلٹ نکلا۔

مجھے اپنا سیب چرانے کا ایک واقعہ یاد آتا ہے جس سے ہونٹوں پر مسکراہٹ کے ساتھ میرے جسم میں جھرجھری بھی آ جاتی ہے۔ وہ سیب کچن میں ایک جالی میں تھے۔ جالی چونکہ اونچائی پر تھی اس لیے ان پر روشنی پڑ رہی تھی۔ ایک دن میں گھر میں اکیلا تھا تو اُنھیں دیکھنے کے لیے اوپر چڑھ گیا۔ میری پہنچ سے باہر تھے۔ میں نے ایک سلاخ کی مدد سے اُن تک پہنچنے کی کوشش کی لیکن سلاخ بہت چھوٹی تھی۔ میں نے اس کے ساتھ ایک اور چھوٹی سلاخ (جو میں کھیلنے کے لئے استعمال کرتا تھا) لگا کر اُسے لمبا کیا۔ میرا مالک شکار کا بہت شوقین تھا۔ وہ اکثر اُن کی مدد سے نشانہ لگایا کرتا تھا اور میں اس وقت اس سے سیب پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں اُسے آہستہ آہستہ جالی

کے پاس لے گیا کہ مجھے ایکدم احساس ہوا (میرے دکھ اور حیرت کا کون اندازہ کر سکتا ہے!) کہ وہ سیب بڑا ہونے کی وجہ سے جالی میں سے نہیں نکل سکتا تھا۔ میں نے اپنے مقصد میں کامیاب ہونے کے لیے پوری کوشش کی۔ سیب کو آدھا کرنے کے لیے چھری استعمال کی، اس کو پکڑنے کے لیے تختے کی پٹی استعمال کی اور میں بالآخر اُس کے ٹکڑے کرنے میں کامیاب ہو ہی گیا اور انہیں نکالنے میں بھی کامیاب ہو ہی چلا تھا لیکن وہ شاید ابھی ٹھیک طرح ایک دوسرے سے جدا نہ ہوئے تھے کیونکہ (میرے رحمدل پڑھنے والو! ذرا میری حالت کا اندازہ کرو) وہ واپس جالی میں جا گرے....!

اگرچہ میں نے اس میں کافی وقت ضائع کیا لیکن میں نے ہمت نہ ہاری۔ اور دوسرے دن پھر کوشش جاری رکھنے کا ارادہ کیا۔ مجھے امید تھی کہ کامیابی میرا مقدر بنے گی۔ میں ایسے اپنے کام میں مصروف ہو گیا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ میں نے یہ بھی نہ سوچا کہ جالی میں میں نے جو دو گواہ چھوڑے ہیں وہ مجھے برطرف کروا سکتے تھے۔

اگلے دن جب مجھے دوبارہ موقع ملا تو میں نے پھر سے کوشش کی۔ دونوں سلاخیں آپس میں جوڑ کر میں سٹول پر چڑھا۔ نشانہ لے کر اپنے شکار پر وار کرنے ہی لگا تھا کہ ایکدم دروازہ کھلا اور میرا مالک اندر داخل ہوا۔ اُس نے اوپر دیکھا اور کہا ''واہ! شاباش''! جیسے ہی مجھے اُس لمحے کی سنگینی کا احساس ہوا، میرا ہتھیار میرے ہاتھ سے گر گیا۔

مسلسل رُوکھے رویے نے مجھے بے حس بنا دیا تھا۔ ایسا رویہ میرے اپنے جرائم کی بنیاد دکھائی دیتا تھا جو مجھے مزید غلط کام کرنے کی ہمت دلاتے تھے اور میں پچھلی سزا پر غور کرنے کی بجائے انتقام لینے پر غور کرنے لگتا تھا۔ کسی غلام کی طرح پیٹے جانے پر مجھے ایسا محسوس ہونے لگتا کہ مجھے تمام بُرے کام کرنے کا حق حاصل ہے۔ مجھے یقین تھا کہ چوری کرنا اور سزا پانا آپس میں تعلق رکھتے تھے اور میرا خیال ہے کہ ان کا تعلق کچھ یوں تھا کہ اگر میں اپنے حصے کا کام کرتا رہوں تو میرا مالک بھی اپنے حصے کے کام میں کمی نہ کرے گا۔ اس بات کا یقین کرنے کے بعد میں نے بڑے سکون سے چوری کرنا شروع کر دی۔ جب کبھی میرے ذہن میں یہ خیال آتا کہ ''اس کا کیا انجام ہوگا'' تو اس کا فوری جواب یہ ہوتا ''کہ زیادہ سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے، مجھے مار پڑے گی اور میں تو پیدا ہی اس لئے کیا گیا ہوں''۔

مجھے اچھا کھانا پسند تھا' میں عیاش ضرور تھا مگر لالچی نہ تھا۔ میری خواہشات اتنی زیادہ تھیں کہ یہ (کھانے کا) شوق کبھی اُن پر غلبہ نہ پا سکا۔ جب میرا دھیان کسی اور طرف نہ ہوتا، تب ہی میں

کھانے کی چیزیں چرانے کی طرف توجہ دیتا تھا۔ یہی عادت دوسری چیزوں میں بھی تھی۔ اگر میں ایک پیشہ ور چور نہیں بنا تو اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ پیسہ کبھی بھی میرے لیے اہمیت نہ رکھتا تھا۔

میرے مالک کی ورکشاپ میں ایک الماری تھی، جسے وہ ہمیشہ تالا لگا کر رکھتا تھا۔ میں اُسے بار بار اپنی مرضی سے کھولنے اور بند کرنے کی سازش کرتا رہتا تھا۔ میں اُس کے بہترین اوزار، اُس کے بنائے ہوئے نقش غرضیکہ ہر وہ چیز جو وہ مجھ سے چھپا کر رکھتا تھا، باہر نکال کر رکھ دیتا تھا۔ یہ تمام کام میں معصومیت میں کرتا تھا۔ میں یہ سوچتا تھا کہ میں نے اُس کا ہنر، اُس کے کام کے ساتھ چرا لیا ہے۔ جن چیزوں کا میں نے ذکر کیا ہے، ان کے علاوہ اُس کے ڈبوں میں سونے اور چاندی کے دھاگے کچھ چھوٹے قیمتی پتھر، تمغے اور پیسے بھی ہوتے تھے۔ میری جیب میں گو پانچ ساؤس (کرنسی) سے زیادہ نہ ہوتے تھے لیکن میں نے ان قیمتی چیزوں پر کبھی نظر بھی نہ ڈالی تھی بلکہ میں انہیں خوشی کے بجائے خوف سے دیکھتا تھا۔

مجھے یقین ہے کہ پیسے نہ چرانے کا یہ خوف زیادہ تر تعلیم کی وجہ سے تھا۔ اس کے ساتھ مجھے بدنامی، قید، سزا اور موت کا خوف بھی تھا۔ اگر مجھے کبھی خواہش ہوتی تو بھی یہ چیزیں مجھے کانپنے پر مجبور کر دیتی تھیں۔ میری یہ ناکامی شاید چوری کی ہی کوئی قسم تھی۔ حقیقت میں اس کی شاید ہی کوئی اور وجہ ہو لیکن اس کی تراش خراش کی جا سکتی تھی اور میں اس کے لیے تیار تھا۔ ڈرائنگ کا ایک کاغذ میرے لیے ان پیسوں سے زیادہ اہمیت رکھتا تھا جن سے میں ایک دستہ خرید سکتا تھا۔ یہ فضول سا سبب میری شخصیت کا اہم پہلو تھا اور اب تک میرے عمل کو متاثر کرتا آیا ہے اس لیے اس کی تشریح اوضاحت ضروری ہے۔

میرے جذبات بہت شدید ہیں اور ان کے ہوتے ہوئے اور کسی چیز کی شدت مجھ پر اثر نہیں کرتی۔ میں امتیاز، عزت، خوف، تہذیب، بداخلاقی، چالاکی، شدت پسندی اور بہادری کے جذبات سے مکمل طور پر نا آشنا ہوں۔ مجھے کسی چیز کی شرم یا ڈر کسی بات سے نہیں روک سکتا۔ میرے ذہن میں اکثر ایک خیال رہتا ہے اور اس کے علاوہ تمام دنیا میرے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی۔ یہ جذبہ بس ایک لمحے کے لیے ہوتا ہے اور اگلے ہی لمحے میں موت کے بارے میں سوچنے لگتا ہوں۔ آپ مجھے سکون کے لمحات میں دیکھیں، میں چھوٹے سے چھوٹا کام (جسے منہ سے ایک لفظ نکالنے) میں بھی آرام طلبی اور نرم دلی کا مظاہرہ کرتا ہوں۔ جبکہ یہ مجھے بہت مشکل محسوس ہوتا ہے۔ ہر چیز مجھے خوفزدہ کرتی ہے۔ مکھی کا اڑنا بھی مجھے دہشت زدہ کر دیتا ہے۔ خوف اور شرم مجھ پر اس طرح حاوی ہو جاتے ہیں کہ میں خود کو فانی نقطہ نظر سے بچا سکتا ہوں۔

اگر میں محبت کرنے کی کوشش کروں بھی تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں؟ اگر مجھے بولنے پر مجبور کیا جائے تو مجھے الفاظ نہیں ملتے اور اگر کوئی میری طرف دیکھ لے تو میں فوراً ہوشیار ہو جاتا ہوں۔ اگر میری موضوع پر گرفت ہو تو میں اپنے خیالات بآسانی بیان کر سکتا ہوں لیکن عام موضوعات پر مجبور کیے جانے کے باوجود کچھ نہیں کہہ پاتا۔

میں یہاں یہ بات بھی شامل کرتا چلوں کہ مجھے کبھی اُن چیزوں کی خواہش نہیں رہی جو خریدی جاسکتی ہوں۔ پیسہ میری خوشی کو برباد کر دیتا ہے اور میں اُس (خوشی) میں کسی قسم کی ملاوٹ نہیں کرنا چاہتا۔ مثلاً مجھے وہ میز بہت پسند ہے لیکن میں اچھی صحبت کی روک ٹوک، شراب خانے میں مے نوشی برداشت نہیں کر سکتا۔ میں ان چیزوں کا صرف ایک اچھے دوست کے ساتھ مزہ اُٹھا سکتا ہوں کیونکہ اکیلے ایسا ممکن نہیں۔ میرے خیالات اس قدر متنوع ہوتے ہیں کہ مجھے اکیلے کھانے کا کوئی مزہ نہیں آتا۔ وہ عورتیں جنھیں (پیسے سے) خریدا جاسکتا ہے وہ میرے لیے کوئی کشش نہیں رکھتیں۔ میرا دل محبت سے مطمئن نہیں ہو سکتا۔ میرے نزدیک یہ اصول تمام چیزوں پر لاگو ہوتا ہے۔ غرضیکہ مجھے اُن تمام چیزوں کا شوق ہے جن سے ملنے والی خوشی کو اُن کے لیے خاص بنائے گئے ذہن ہی ناپ سکتے ہیں۔

مجھے پیسوں کی کبھی ایسی خواہش نہیں رہی جیسی عام طور پر ہوتی ہے۔ اس سے لطف اندوز ہونے کے لیے آپ کو اُسے تبدیل کرنا ہوتا ہے جس کے دوران تکلیف اُٹھانا پڑتی ہے۔ آپ کو سودا کرنا پڑتا ہے، خریدنا پڑتا ہے، قیمت ادا کرنا پڑتی ہے، اکثر آپ کی ضرورت صحیح طرح پوری نہیں کی جاتی بلکہ دھوکا بھی دیا جاتا ہے۔ میں ایک انڈہ خریدتا ہوں تو مجھے یقین دلایا جاتا ہے کہ وہ تازہ ہے لیکن وہ باسی نکلتا ہے۔ پھل کو پکا ہوا کہا جاتا ہے لیکن وہ کچا ہوتا ہے۔ لڑکی ___ اور چاند میں بھی داغ ہوتے ہیں! مجھے اچھی شراب پسند ہے لیکن وہ مجھے کہاں ملے گی۔ شراب کے تاجر کے پاس یقیناً ہے کہ وہ مجھے ضرور دے دے گا۔ میں چاہتا ہوں ہر جگہ میری عزت کی جائے تو میں اپنا یہ مقصد کس طرح پورا کروں؟ مجھے دوست بنانے چاہئیں اور اُنھیں پیغام بھیجنے چاہئیں۔ اُن کے پاس آنا جانا، اُن کا انتظار کرنا اور ان سے اکثر دھوکا کھانا چاہیے۔ پیسہ دائمی اضطراب کا سبب ہے۔ مجھے اچھی شراب سے جتنی محبت ہے اُس سے زیادہ پیسے سے خوف آتا ہے۔

اپنی ملازمت کے دوران ہزار مرتبہ میں کوئی اچھی چیز خریدنے گیا۔ میں بیکری پر جاتا ہوں اور وہاں کاؤنٹر پر کچھ خواتین کو کھڑے دیکھتا ہوں۔ میں یہ سوچتا ہوں کہ وہ مجھ پر ہنس رہی ہیں۔ میں پھل کی دکان سے گزرتا ہوں اور میری نظر کچھ اچھی ناشپاتیوں پر پڑتی ہے۔ اُن کی شکل مجھے

اچھی لگتی ہے لیکن کچھ دو تین چھوٹے بچے میرے پاس سے گزرتے ہیں یا کوئی ایسا آدمی جسے میں جانتا ہوں، دروازے پر کھڑا ہے۔ میرے خیال میں یہ وہ لوگ ہیں جنھیں میں جانتا ہوں لیکن میری نظر مجھے دھوکہ دے جاتی ہے اور کوئی نہ کوئی چیز مجھے روک لیتی ہے۔ میں جیسے آیا تھا ویسے ہی پلٹ جاتا ہوں کیونکہ میں وہ خریدنا چاہتا ہوں جس کی مجھے خواہش ہے۔

وہ تمام مشکلات، شرمندگی، کراہت اور زحمت جو مجھے اپنے پیسوں سے جدا ہونے کے لیے اُٹھانی پڑیں (چاہے ایسا میں خود کروں یا دوسروں کی مدد سے) اُن کو بیان کرنے کے لیے مجھے تمام تفصیلات بتانی چاہئیں۔ جونہی میں اُنھیں بیان کروں گا میرے پڑھنے والے میرے رویے کا سبب جان جائیں گے اور مزید کچھ کہے بغیر (میری بات) سمجھ جائیں گے۔

یہ بات سمجھنے کے بعد میرے اندر موجود اس خاص تضاد کو آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے۔ لالچ کی سب سے بڑی وجہ پیسہ ہوتی ہے۔ وہ متحرک شے جو میرے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی۔ جب میں اس سے محروم ہوتا ہوں تو مجھے اسے حاصل کرنے کی کوئی خواہش نہیں ہوتی اور اگر یہ میرے پاس فراوانی سے ہو تو پھر میں اپنی جیب آزادی سے خالی کر دیتا ہوں۔ میں اپنے قاری کو یہ تاثر نہیں دینا چاہتا کہ میں (دکھاوے کے لیے) فضول خرچی کرتا ہوں بلکہ میں تو اسے ظاہر نہیں کرتا اور چھپانے کی کوشش کرتا ہوں۔ میں یہ بات اچھی طرح سمجھتا ہوں کہ پیسہ میرے مقاصد کو پورا نہیں کر سکتا کہ اگر یہ میرے پاس ہو تو میں شرمندہ رہتا ہوں۔ اس سے زیادہ شرمندگی مجھے اسے خرچ کرتے وقت ہوتی ہے۔

اگر میرے پاس آزادی ہو تو مجھے یقین ہے کہ میں لالچ کی طرف مائل نہ ہوں گا۔ میں کبھی مزید پیسوں کی حرص نہ کرتا اور اپنی آمدنی میں ہی خوش رہتا۔ لیکن میری اس حالت نے مجھے مسلسل خوف میں مبتلا رکھا ہے۔ میں آزادی پسند ہوں اور مجھے روک ٹوک، کسی پر انحصار کرنے اور ایسی دوسری باتوں سے سخت نفرت ہے۔ جب تک میری جیب میں پیسے رہتے ہیں خود کو آزاد سمجھتا ہوں۔ اور مجھے دوسروں سے مانگنے کی تکلیف نہیں اُٹھانا پڑتی، جس سے میں ہمیشہ ڈرتا ہوں۔ اپنی آزادی کھو دینے کا ڈر مجھے پیسے خرچ کرنے سے روکتا ہے۔ ہمارے پیسے ہماری آزادی کا ٹکٹ ہوتے ہیں جنھیں حاصل کرنے کے لیے ہم تگ و دو کرتے ہیں۔ وہ ہماری غلامی کا سبب بھی بنتے ہیں۔ سو مجھے اتنے ہی پیسوں کی ضرورت ہے اور اس سے زیادہ کی مجھے حرص نہیں ہے۔

لہٰذا میری بے غرضی اصل میں میری آرام طلبی ہے۔ میرے نزدیک (کسی چیز کو) پانے کی خواہش اُس کے حصول کے لیے اُٹھائی جانے والی تکلیف سے زیادہ نہیں ہوتی۔ میری بربادی بھی

اسی آرام طلبی کی دوسری شکل ہے۔ جب ہمارے پاس اچھی طرح خرچ کرنے کا موقع ہو تو ہمیں اس کا بھرپور فائدہ اُٹھانا چاہیے۔

میرے لیے دوسری چیزوں کی کشش پیسے سے زیادہ ہے کیونکہ اسے پالینے اور اس سے کسی پسندیدہ چیز کو حاصل کرنے کے درمیان مختصر سا ہی سہی ایک وقفہ ہوتا ہو جبکہ کسی چیز کو پالینے کا مطلب ہی اس کا لطف اُٹھانا ہوتا ہے۔ اگر میں کوئی چیز دیکھوں تو مجھے اس کی خواہش ہو سکتی ہے لیکن اگر میں وہ چیز نہ دیکھوں بلکہ صرف اُسے پالینے کا ذریعہ دیکھوں تو اس میں میرے لیے کوئی کشش نہیں ہے۔ بس اسی لیے میں چور تھا اور اب بھی ہوں اور وہ اس طرح کہ میں وہ چھوٹی چھوٹی چیزیں چراتا تھا، جن کی مجھے خواہش ہوتی تھی اور جنھیں مانگنے سے زیادہ چرالینا مجھے آسان محسوس ہوتا تھا۔ مگر زندگی میں میں نے کبھی کسی سے ایک پائی بھی نہیں چرائی سوائے اس کے کہ پندرہ سال قبل میں سات فرانک اور دس 'ساؤس' چرائے تھے۔ یہ واقعہ سنائے جانے کے قابل ہے کیونکہ اس سے اُس قابلیت اور بے وقوفی کا پتہ چلتا ہے جس کا تعلق اگر میرے سوا کسی اور سے ہوتا تو میں شاید ہی اس کا ذکر کرتا۔

یہ واقعہ پیرس کا ہے میں مسٹر ڈی فرانسوئیل کے ہمراہ رائل پیلس کے قریب چہل قدمی کر رہا تھا۔ اُس نے اپنی گھڑی نکالی اور اُسے دیکھ کر مجھے کہنے لگا "کیا ہم اوپیرا (Opera) دیکھنے چلیں؟ میں نے بخوشی حامی بھر لی اور ہم چل پڑے۔ اُس نے دو (فیملی باکس کی) ٹکٹیں خریدیں اور ایک میرے حوالے کر دی۔ دوسری وہ خود لے کر اندر داخل ہو گیا۔ میں بھی اس کے پیچھے اندر داخل ہونے لگا تو دروازے پر رش تھا۔ اندر دیکھا تو ہر کسی کو کھڑے پایا۔ میں نے سوچا مسٹر ڈی فرانسوئیل سمجھ جائے گا کہ میں بھیڑ میں کہیں پھنس گیا ہوں اور یہ سوچ کر میں باہر نکل آیا۔ میں نے اپنی ٹکٹ واپس کر کے پیسے (واپس) لیے اور یہ سوچے بغیر گھر چلا آیا کہ اب تک سب لوگ بیٹھ چکے ہوں گے اور مسٹر ڈی فرانسوئیل کو پتہ چل جائے گا کہ میں وہاں موجود نہیں ہوں۔

چونکہ کوئی اور چیز میری طبیعت میں پائی جانے والی خودغرضی کے برابر نہیں ہو سکتی لہٰذا میں اُس کو یہ بتانے کے لیے نوٹ کرتا ہوں کہ اضطراب کے کچھ لمحے ایسے ہوتے ہیں جب انسان اپنے عمل سے نہیں پہچانا جاتا۔ میرا مقصد پیسے چرانا نہیں تھا بلکہ اُس کا استعمال چرانا تھا اور یہ اس لیے زیادہ بدنام ہے کہ یہ آپ کی خواہش کو جائز ثابت کرتا ہے۔

اگر میں ان تمام ادوار کو بیان کرنا چاہوں جن سے میں اپنی ملازمت اور اپنے ہیرو سے غنڈا بننے کے دوران گزرا تو مجھے یہ واقعات بیان کرتے رہنا چاہئیں۔ میں اپنی اس حالت میں

تمام برائیوں سے گزرا لیکن مجھے اُن سے ملنے والی خوشی سے کوئی مزہ نہ آتا تھا۔ میرے ساتھیوں کی خوشی مجھے کوئی لطف نہ دیتی تھی۔ جب بہت زیادہ روک ٹوک سے میرا کام میرے لیے ناقابل برداشت ہو گیا تو میرے لیے اس میں تفریح کا کوئی عنصر باقی نہ رہا۔ اس سے میرا پڑھنے کا شوق دوبارہ زندہ ہو گیا۔ میرا یہ شوق روک ٹوک کی وجہ سے میرا جنون بن گیا۔ 'لیٹر یبو' ایک جانی پہچانی لائبریرین تھی اور مجھے ہر طرح کی اچھی بُری کتابیں فراہم کرتی تھی جنھیں میں بغیر کسی تفریق کے بہت جذبے کے ساتھ پڑھتا تھا۔

یہ کہا جائے گا کہ "آخر کار پیسہ ضرورت بن (ہی) گیا" ____ یہ سچ ہے لیکن ایسا اُس وقت ہوا جب میرے پڑھنے کے شوق نے مجھے ہمت اور کام کرنے سے محروم کر دیا۔ میں اس میں کھو سا گیا مجھے صرف پڑھنے کی خواہش ہوتی تھی اور میں اب چوری بھی نہ کرتا تھا۔ یہ میری ایک اور خصوصیت تھی۔ کبھی کبھی ایک ایسی چیز جس کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی، مجھے اُس چیز سے جدا کر دیتی ہے جس سے میں بہت زیادہ قریب ہوتا ہوں۔ میں نے اس شوق کے سامنے سر جھکا دیا اور وہ میرا جنون بن گیا۔ میں نے پچھلی تمام خواہشات ایکدم بھلا دی تھیں۔



(کتابیں) پڑھنا میرا نیا مشغلہ تھا۔ میرا دل، جیب میں رکھی کتاب کو پڑھنے کے لیے بے قرار رہتا تھا۔ جیسے ہی مجھے کوئی فارغ لمحہ میسّر آتا ہے میں اُسے باہر نکال لیتا ہوں اور میرے ذہن سے اپنے مالک کی الماری کی تلاشی کا خیال بالکل نکل جاتا ہے۔ مجھے یہ سوچ کر بھی شرم آنے لگتی ہے کہ میں ایسی (ذلیل / خود غرض) حرکت کر سکتا ہوں۔ اگر میری تفریح اتنی مہنگی نہ ہوتی تو میں شاید یہ عادت (چوری کرنا) اب تک چھوڑ چکا ہوتا۔ لیٹر یبو مجھے قرضہ دے دیتی اور جیسے ہی کتاب میری قبضے میں آجاتی میں یہ بالکل بھول جاتا کہ مجھے اس کی قیمت ادا کرنی ہے۔ جیسے ہی پیسے آتے تو وہ قدرتی طور پر اُس عورت کے پاس چلے جاتے۔ اگر کبھی وہ اصرار کرتی تو میرے پاس اپنی ذاتی چیزوں کے علاوہ کچھ نہ ہوتا اور میں اتنا دور اندیش تو تھا نہیں کہ پہلے سے کوئی چیز چرا کر رکھتا۔ قرض چکانے کے لیے چوری کرنا میرے لیے کوئی کشش نہ رکھتا تھا۔

ایک سال سے کم عرصے میں، میں نے لیٹر یبو کی چھوٹی سی لائبریری پڑھ ڈالی۔ پھر مزید تفریح کی ضرورت نے مجھے اداس کر دیا۔ میرے اس (پڑھنے کے) شوق نے میری بچگانہ عادات کا خاتمہ کرا دیا اور میرے اونچے خیالات واپس آ گئے اگرچہ میری حالت ایسی نہ تھی۔ اس دوران میں اپنی دسترس میں موجود ہر شے سے متنفر ہو چکا تھا اور ان میں سے ہر اچھی چیز کے بارے میں سوچتا تھا۔ میری موجودہ صورتحال نہایت بُری تھی۔ میرے جذبات نے زور پکڑنا شروع کیا اور

یہ سوچے بغیر کہ یہ مجھے کہاں لے جائیں گے میں نے ان کا اثر لینا شروع کر دیا۔ میں اصل تفریح سے اتنا ہی دور تھا جیسے میں لاجنس ہوں۔ کبھی کبھار میں ماضی میں کی گئی اپنی بے وقوفیوں کے بارے میں سوچتا تھا لیکن میری سوچ اس سے آگے نہ جاتی تھی۔

اس وقت میری سوچ نے ایک ایسا موڑ لیا جس نے میرے جذبات کو ٹھنڈا کرنے میں بہت مدد دی۔ میں جو پڑھتا تھا اسے اپنے اوپر لاگو کر لیتا۔ اس کا مجھ پر حیرت انگیز اثر ہوا۔ میں انہیں خود پر ایسے لاگو کرتا کہ میں اپنے پسندیدہ ہیرو جیسا کوئی کردار بن جاتا۔ میں مسلسل اس خیالی دنیا میں رہتا' جو مجھے زیادہ بہتر لگتی تھی۔ مختصراً یہ کہ میں خود کو ان فرضی واقعات میں اس طرح جگہ دیتا کہ اصل زندگی کا خیال جیسے مٹ سا جاتا تھا۔

ان فرضی چیزوں کی محبت اور وہ آسانی' جس سے میں اُن کو پالیتا تھا' نے مجھے اپنے اردگرد ہر شے سے متنفر کر دیا تھا۔ اُس نے میرے اندر پہلے سے موجود تنہائی کے احساس کو مضبوط کر دیا تھا۔ ہمارے پاس کے اثرات کا مشاہدہ کرنے کے لیے ایک سے زیادہ موقع ہوں گے۔ ایک ایسی طبیعت جو بظاہر محروم' بیزار اور افسردہ لگتی ہے لیکن جو اصل میں ایک محبت بھرے اور پر جوش دل سے جنم لیتی ہے۔ کیونکہ وہ اپنے جیسی فطرت کو تلاش کرتی ہے اور پھر خود کو فرضی چیزوں کے ساتھ محدود کرنے اور اسی پر اکتفا کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔ اس موقع پر اتنا کہنا کافی ہوگا کہ ہم اس خواہش کی بنیاد کو جان سکیں جس نے میرے جذبات کو تبدیل کر کے رکھ دیا اور ان کو محدود کر دیا۔ اُسی نے میرا اشتیاق اس قدر بڑھایا اور پھر مجھے اتنا کاہل بنا دیا کہ میں انہیں حاصل نہ کر سکوں۔

غرضیکہ میں جب سولہ برس کا ہوا تو میری طبیعت کے اندر بے حد اضطراب تھا۔ اپنے اردگرد موجود ہر شے سے غیر مطمئن تھا۔ میں اپنے پیشے سے بھی ناخوش تھا۔ اس عمر میں ملنے والی خوشیوں سے میں ناآشنا تھا بغیر کسی وجہ کے رو پڑتا اور آہیں بھرتا تھا۔ میں حقیقت سے متعلق اپنے (وہمی) خیالات پر بہت نازاں تھا۔

ہر اتوار میرے ساتھی مجھے باہر لے جانے آتے' وہ چاہتے کہ میں اُن کی تفریح میں حصہ لوں۔ شاید میری جان بچ جاتی لیکن (مسئلہ یہ تھا کہ) اگر ایک بار میں اُن کے ساتھ شامل ہو جاتا تو ان سے زیادہ ذوق وشوق سے اُس میں حصہ لیتا۔ مجھے اپنے ساتھ ملانا یا روکے رکھنا دونوں ہی مشکل کام تھے۔ یہ میرے کردار کا ایک خاص پہلو تھا۔ چہل قدمی کے دوران میں سب سے آگے ہوتا جب تک کوئی یاد نہ دلاتا مجھے واپس جانے کا خیال بھی نہ آتا۔ دو بار تو ایسا بھی ہوا کہ میں ساری رات اپنے مالک کے پاس واپس نہ پہنچ سکا جس کی وجہ یہ تھی کہ میرے پہنچنے سے قبل شہر کے

دروازے بند ہو چکے تھے۔ پڑھنے والے بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ پھر میرا کیا حشر ہوا ہوگا۔ لیکن میں اپنے ارادے پر قائم نہ رہ سکا اور مجھ سے یہ غلطی پھر سرزد ہوئی۔ میری ہوشیاری ایک منتول نامی کیپٹن کی وجہ سے دھری کی دھری رہ گئی کیونکہ جب بھی اس کی ڈیوٹی ہوتی وہ دروازے مقررہ وقت سے ایک گھنٹے پہلے بند کر دیتا تھا۔ میں اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ گھر لوٹ رہا تھا اور سیر کرنے کی غرض سے شہر سے ڈیڑھ کوس ہی دور تھا کہ میں نے اُنھیں نقارہ بجاتے سنا۔ میں اپنی پوری رفتار کے ساتھ بھاگتا ہوا پل پر جا پہنچا اور میں نے فوجیوں کو چوکی پر دیکھا۔ میں نے گھٹی ہوئی آواز میں انہیں پکارا لیکن بہت دیر ہو چکی تھی کہ میں چوکی سے بیس قدم کے فاصلے پر تھا اور پہلا پل اُٹھایا جا چکا تھا۔ میں نے خوف سے اس منحوس نقارے کو سنا جس کی آواز میری بدقسمتی کا اعلان کر رہی تھی جو اُس لمحے کے بعد شروع ہو گئی تھی۔

میں نے خود کو بے بسی کے عالم میں ڈھلان پر گرا دیا۔ میرے ساتھی جواب تک اس حادثے پر ہنس رہے تھے، ــــ انھوں نے کہا کہ اب کیا کرنا چاہیے؟ میں نے بھی اُسی لمحے ایک فیصلہ کیا جو اُن سے بالکل مختلف تھا۔ میں نے قسم کھائی کہ میں اب کبھی اپنے مالک کے پاس نہ لوٹوں گا۔ اگلی صبح جب میرے ساتھی شہر میں داخل ہوئے تو میں نے انہیں ہمیشہ کے لیے الوداع کہا اور ساتھ ساتھ اُنھیں میرے کزن برنارڈ کو اس فیصلے سے آگاہ کرنے کی ہدایت بھی کی۔ میں نے اُنھیں اس جگہ کے بارے میں بتایا جہاں وہ مجھ سے آخری بار مل سکتا تھا۔

اپنی ملازمت کے اختتام کے بعد میں نے اُسے بہت کم دیکھا۔ شروع شروع میں ہم اتوار کو ایک دوسرے سے ملتے تھے لیکن پھر عادتیں بدلتی گئیں اور یہ سلسلہ کم ہوتا گیا۔ مجھے یقین ہے کہ اس تبدیلی میں اُس کی ماں کا بڑا ہاتھ تھا۔ وہ خود کو بڑا آدمی سمجھنے لگا تھا اور میں ایک معمولی سا ملازم تھا۔ ہمارے درمیان جو برابری کا رشتہ تھا وہ ختم ہو گیا۔ مجھے ملنے سے اس کی شان میں فرق آتا تھا۔ چونکہ قدرتی طور پر وہ اچھے دل کا مالک تھا۔ اس لیے اس کی ماں کے سبق نے اس پر فوری اثر نہ کیا اور وہ کچھ عرصے تک وہ مجھے ملتا رہا۔

میرا ارادہ جان لینے کے بعد وہ فوراً مجھے اس طے شدہ مقام پر ملنے چلا آیا۔ وہ مجھے روکنے نہ آیا تھا بلکہ میرے سفر کو آسان بنانے کے لیے کچھ چھوٹی موٹی چیزیں لے کر آیا تھا کہ میرے ذرائع ناکافی تھے۔ دوسری چیزوں کے علاوہ اُس نے مجھے ایک تلوار بھی دی جس پر مجھے بہت ناز تھا۔ یہ ٹیورن تک میرے ساتھ رہی۔ جہاں مجھے یہ چھوڑنی پڑی۔ جب میں اس اہم موڑ پر اس کے رویے پر غور کرتا ہوں تو میرا اس پر یقین بڑھ جاتا ہے کہ وہ اپنی ماں کی ہدایت پر عمل کر رہا تھا اور شاید اپنے

والد کی بھی۔ اگر وہ یہ سب اپنی مرضی سے کر رہا ہوتا تو وہ مجھے روکنے کی کوشش کرتا یا پھر میرے ساتھ چلتا۔ اس کے برعکس اس نے میرے منصوبے میں میری مدد کی۔ جب اُس نے دیکھا کہ میں اپنے ارادے پر قائم ہوں تو وہ اس سے متاثر ہوئے بغیر مجھے میرے حال پہ چھوڑ کر چلا گیا۔ اس کے بعد ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا اور نہ ہی کوئی خط و کتابت کی۔ مجھے اس نقصان پر (ہمیشہ) پچھتاوا رہا کیونکہ وہ دل کا بہت اچھا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ ہماری دوستی ہمیشہ قائم رہے گی۔

اس سے پہلے کہ میں خود کو قسمت کے حوالے کر دوں مجھے ایک لمحے کے لیے تصور کرنے دیجئے کہ اگر میرا مالک ایک اچھا آدمی ہوتا تو میرے حالات کیسے ہوتے۔ میرے لیے سب سے موزوں بات یہ ہوتی کہ میں کسی اچھے دستکار کے پاس ملازمت کرتا کہ یہ پیشہ بھی نقش نگاری کی طرح جنیوا میں قابل عزت سمجھا جاتا تھا۔ میں بہت اچھا نہیں تو بآسانی گزارہ کر سکتا تھا۔ اس سے میرے ارادے محدود رہتے۔ میرے پاس اپنی چھوٹی چھوٹی ضروریات پوری کرنے کے لیے مناسب رقم ہوتی۔ میں اپنی حد سے باہر نکلنے کی کوشش نہ کرتا۔ میری سوچ اس قدر زرخیز تھی کہ ہر قسم کی صورتحال کے باوجود میں حالات کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھال لیتا۔ یہ میرے لیے بہت مناسب ہوتا، اس میں زیادہ محنت بھی درکار نہ تھی اور میرا ذہن بھی آزاد رہتا۔ اس طرح میں بآسانی خوش رہتا۔ اپنے ملک، مذہب، خاندان اور دوستوں کے درمیان ایک اچھا پیشہ اپنا کر ایک پُرسکون زندگی گزارتا۔ پھر وہ تعلقات بھی میرے قریب رہتے جو مجھے بے حد عزیز تھے۔ میں ایک اچھا عیسائی، شہری، دوست اور انسان ہوتا۔ میں اپنے حالات سے خوش ہوتا اور شاید اُنھیں عزت بخشتا۔ اپنے خاندان کے درمیان گمنام مگر خوش و خرم زندگی گزار کے میں جب مرتا تو شاید مجھے جلد ہی بھلا دیا جاتا۔ لیکن مجھے نرم دل اور دکھ کے ساتھ یاد کیا جاتا۔

اس کے بجائے میں نے کیا تصویر بنائی؟ آہ___! جو تکالیف میں نے اُٹھائیں اُن کا ذکر مجھے کیوں کرنا پڑ رہا ہے؟ میرے پڑھنے والے کے لیے یہ بہت دکھی موضوع ہوگا!

---

## حواشی و حوالہ جات:

۱۔ یہ تمام خوبیاں ان کے اس وقت کے حالات کی وجہ سے بہت نمایاں تھیں، ان کے والد نے ان کی تعلیم کے لیے کافی تکالیف اُٹھائی تھیں۔ انہیں نقاشی، گانا اور سارنگی بجانا سکھایا گیا تھا۔ وہ شاعری بھی کر لیتی تھیں۔ ذیل میں اُن کے فی البدیہہ اشعار کا نمونہ دیا گیا ہے

جوانہوں نے اپنے خاوند اور بھائی کی غیر موجودگی میں ان سے متعلقہ ایک شخص سے دوران گفتگو کہے؛ جب وہ اپنی بھابھی اور ان کے دو بچوں کے ساتھ چہل قدمی کر رہی تھیں:

These absent ones, who justly claim

our hearts, by every tender name,

To whom each wish extends:

Our husbands and our brothers are

The fathers of this blooming pair,

Our loves and our friends.

O

# دوسری کتاب

(1728-1731ء)

وہ لمحہ جب میں نے اس جگہ کو چھوڑنے کا فیصلہ کیا، بہت ہولناک محسوس ہوا لیکن اس پر عمل کرنا بہت خوش کن ثابت ہوا۔ ایسے رشتے داروں اور ذرائع کو ایسی عمر میں چھوڑنا، جبکہ میں ابھی ملازمت کرتا تھا اور بچہ ہی تھا اور میں نے ابھی اتنا کام بھی نہ سیکھا تھا کہ خود کما سکتا۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ میں جو کہہ رہا ہوں وہ خطرے اور تباہی سے بھرپور ہے۔ میں نے اس معصومیت اور کمزوری کی عمر میں خود کو تمام برائیوں کے لیے آزاد چھوڑ دیا تھا اور غلطیوں، بدقسمتیوں، پھندوں، غلامی اور موت کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا تھا۔ ایک برائی سے بچنے کے چکر میں، میں کئی برائیوں میں پھنس سکتا تھا۔ میں جو تصویر بنانے جا رہا تھا' میرے اس خطرناک کارنامے کا یہی نتیجہ تھا؟ میں نے اسے کتنا مختلف سوچا تھا۔ میرے تصور میں صرف وہ آزادی تھی جو میرے خیال میں کبھی میرے پاس (ہونی چاہیئے) تھی۔ میرا خیال تھا کہ یہ آزادی پا کر میں ہر شے حاصل کر سکوں گا۔ میں زندگی کے وسیع تھیٹر میں اعتماد کے ساتھ داخل ہوا جسے میں اپنی خوبیوں سے سر کرنا چاہتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ ہر قدم پر مجھے تفریح، تحفے، خزانے اور دلچسپ لمحات ملیں گے۔ دوست ہمہ وقت میری مدد اور عورتیں مجھے خوش کرنے کو تیار ہوں گی۔ مجھے صرف خود کو ظاہر کرنا ہوگا اور پھر تمام کائنات میری طرف متوجہ ہو جائے گی لیکن میں بہت کم پر قناعت کر لوں گا۔ میں ایک اچھی سوسائٹی میں قابل گزارہ ذرائع کے ساتھ میں مطمئن زندگی گزاروں گا۔ میری میانہ راوی کا یہ حال تھا کہ میں ایک محدود دائرے میں رہ کر چمکنا چاہتا تھا۔ لیکن اس میں بس خوشی ہوتی اور میں اس کا واحد مرکز ہوتا۔ مثال کے طور پر (حرف) ایک محل (اگر مجھے دیا جائے) تو وہ میرے (مقاصد) جذبات کو پورا نہ کرے گا جبکہ اگر میں بادشاہ اور ملکہ کا نور نظر ہوتا، شہزادی کا عاشق، شہزادے کا دوست اور ہمسایوں کا محافظ ہوتا تب میں شاید کسی حد تک خوش رہتا اور مزید کی خواہش نہ کرتا۔

ان سب چیزوں کی تلاش میں، میں کچھ دن شہر کے احاطے میں پھرتا رہا۔ مضافات کے کچھ لوگ جو مجھے جانتے تھے مجھے شہر کے لوگوں سے زیادہ عزت دیتے رہے۔ وہ مجھے خوش آمدید کہتے' رہائش کے لیے جگہ دیتے اور مجھے اپنی خوشی سے کھانا دیتے۔ میں چندے پر نہ رہ رہا تھا کہ یہ تمام

مہربانیاں دل میں بُرائی کے کسی احساس کے بغیر کی جا رہی تھیں۔

اسی طرح آوارہ گردی کرتا میں کنفائی گان پہنچ گیا جو ساوے کا ایک حصہ اور جنیوا سے چھ کوس کے فاصلے پر ہے۔ وہاں کے پادری کا نام م تھا اور وہ بہت مشہور انسان تھا۔ میں بھی یہ دیکھنے کے لیے متجسس تھا کہ سپون (Spoon) کے شرفاء کی آل اولاد دیکھنے میں کیسی لگتی ہے، سو میں اس مسٹر ڈی پونٹوَیر سے ملنے چلا گیا۔ وہ مجھ سے بہت اخلاق سے پیش آیا۔ وہ جنیوا (کے لوگوں) کے کفر کے بارے میں بات کرتا رہا' اس نے مقدس چرچ کے اختیارات پر بھی تقریر کی اور پھر مجھے کھانے کی دعوت دی۔ مجھے ان باتوں پر بہت کم اعتراض تھا کہ ان کا ایک نتیجہ نکلتا تھا۔ میں یہ ماننے کو تیار تھا کہ جو اتنا اچھا کھانا کھلا سکتے ہیں وہ اتنے ہی اچھے پادری بھی ہونگے۔ میرا شجرۂ نسب تو اس سے اچھا نہ تھا تعلیم (معلومات) اس سے یقیناً زیادہ تھی۔ لیکن میں ایک ماہر عالم دین کے بجائے ایک اچھا ساتھی بننا چاہتا تھا۔ اس کی وہ Frangi شراب جو میرے خیال میں بہت مزیدار تھی۔ اس کے حق میں ایک ایسی مضبوط دلیل تھی کہ مجھے اتنے اچھے میزبان کو ہراتے کراتے ہوئے شرم محسوس ہوتی تھی۔ سو میں نے اسے جیتنے دیا یا یوں کہہ لیجیے خود مقابلے میں حصہ لینے سے ہی انکار کر دیا۔ میری اس دور اندیشی کو آپ ریاکاری سمجھ سکتے ہیں حالانکہ میں صرف خوش اخلاقی کا مظاہرہ کر رہا تھا جو ان لوگوں میں خوشامد یا پھر انکساری ہمیشہ ایک نقص نہیں ہوتی بلکہ کبھی کبھار یہ ان کی صفت بھی ہو سکتی ہے۔ جب کوئی آپ سے نرمی سے پیش آئے تو آپ قدرتی طور پر خود کو اس انسان سے قریب محسوس کرتے ہیں جس نے آپ پر یہ مہربانی کی۔ ہم اس کو دھوکہ دینے کے لیے اس کی بات نہیں مانتے بلکہ یا تو اس کو تکلیف پہنچانے کا خوف یا پھر یہ خوف کہ کہیں ہم اس کی اچھائی کا جواب بُرائی سے دے کر ناشکری کا مظاہرہ نہ کریں، ہمیں اس چیز سے باز رکھتا ہے۔ مسٹر ڈی پونٹوَیر یکو میری مہمان نوازی، مجھ سے عزت سے پیش آنے اور مجھے قائل کرنے کے لیے محنت کرنے میں کیا دلچسپی ہو سکتی تھی، کچھ نہیں بلکہ میرے دل نے مجھ سے کہا کہ اس میں میرا ہی فائدہ تھا اور میرے دل میں اُس سخی پادری کی عزت اور شکر گزاری سرایت کر گئی تھی۔ مجھے اپنی برتری کا احساس تھا لیکن اس کی مہمان نوازی کا فائدہ اُٹھانے کو دل نہ چاہتا تھا۔ اس سارے عمل میں منافقت یا مذہب بدلنے کا خیال کہیں بھی شامل نہ تھا بلکہ یہ (دوسرا) خیال تو میرے ذہن میں دور دور تک کہیں موجود نہ تھا۔ اس خیال کو میں اس خوف سے دیکھتا تھا کہ اس کا امکان بالکل ہی ختم ہو گیا تھا۔ میرا مقصد صرف ان لوگوں کو دکھ سے بچانا تھا جو مجھ سے شفقت سے پیش آتے تھے۔ میں ان کے نیک خیالات کو دل میں رکھنا چاہتا تھا اور انہیں ان کی کامیابی کی اُمید دلانا چاہتا تھا۔ میں

جتنا محتاط تھا اتنا ان پر ظاہر نہ کرنا چاہتا تھا۔ اس سلسلے میں میرا رویہ ان (دیانتدار) عورتوں کے ناز نخروں کی طرح تھا جو اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لیے بغیر کسی سے کوئی وعدہ کیے ان کی ان اُمیدوں کو بڑھاوا دیتی ہیں جنھیں پورا کرنا ان کا مقصد نہیں ہوتا۔

دلیل، پارسائی اور تہذیب کا تقاضا تھا کہ میری بے وقوفی کی حوصلہ افزائی کے بجائے مجھے اس غلط کام سے منع کیا جاتا تھا اور مجھے میرے خاندان کے پاس واپس بھیج دیا جاتا تھا۔ جو کوئی بھی نیک نیت ہوتا وہ ایسا کرسکتا تھا لیکن غور کیجیے کہ مسٹر ڈی پونٹوری جو ایک مذہبی انسان تو تھا ہی لیکن نیک نیت نہ تھا، وہ صرف ایک رواج میں بندھا ہوا شخص تھا جسے تصویروں کو پوجنے اور تسبیح کے دانے گننے کے علاوہ کچھ نہ آتا تھا۔ مختصراً یہ کہ وہ ایک ایسا مبلغ تھا جس کے نزدیک سب سے بڑی نیکی جنیوا کے پادریوں کے خلاف معاندانہ تحریریں لکھنا تھا۔ وہ مجھے واپس بھیجنا تو درکنار، ان کوششوں میں تھا کہ میرے فرار ہونے کی کوشش میں میرا ساتھ دے (اور) اگر میں واپس بھی جانا چاہتا تو ایسا کرنے کی ہمت اس نے مجھ سے لے لی تھی۔ (اگرچہ ایسا ہونا بہت مشکل تھا لیکن) وہ مجھے بھوکا مرنے کے لیے یا کوئی بُرا شخص بننے کے لیے بھیج رہا تھا۔ لیکن یہ سب اس کا مقصد نہ تھا۔ اسے تو بس ایک ایسا شخص نظر آ رہا تھا جس کے عقائد چرچ کے اصولوں کے خلاف تھے اور اب وہ راہ راست پر آ گیا تھا۔ اب میں چاہے، ایک اچھا انسان تھا یا بُرا یہ اس کے لیے بے معنی تھا۔ اس کے لیے جو بات اہمیت رکھتی تھی، وہ میرا چرچ جانا تھا۔ سوچنے کا یہ نامعقول انداز صرف کیتھولک فرقے تک محدود نہیں ہے بلکہ یہ ہر اس انسان کی آواز ہے جو صرف عقیدوں پہ چلتا ہے اور جہاں اچھائی کی بنیاد کسی صفت کے بجائے عقائد پر ہوتی ہے۔

مسٹر ڈی پونٹوری کہتا تھا ''تمھیں خدا نے بُلایا ہے تم اینسی جاؤ، وہاں تمھیں ایک نیک اور خداترس عورت ملے گی۔ وہ بادشاہ کی فیاضی کی وجہ سے لوگوں کو ان گناہوں سے بچاتی ہے جنھیں وہ بدقسمتی سے کر بیٹھتے ہیں''۔ وہ کسی میڈم ڈی ورین کے بارے میں بات کر رہا تھا جو نئی نئی عیسائی ہوئی تھی اور جس کے پاس وہ پادری ان لوگوں کو بھیجنے کی کوشش کرتا تھا جو اپنی روح بیچنے کو تیار تھے۔ اس طرح وہ ایک لحاظ سے سارڈینیا کے بادشاہ سے دو ہزار فرانک کی پنشن لینے پر مجبور تھی۔ مجھے یہ سوچ کر بے حد شرم آئی کہ اس کے خیال میں مجھے ایک نیک اور خداترس عورت کی ضرورت تھی۔ اس بات پر مجھے کوئی اعتراض نہ تھا کہ مجھے میری ضرورت کی چیزیں کوئی فراہم کرے لیکن چندے کے طور پر کسی سے ایک پائی بھی وصول کرنے کی مجھے کوئی خواہش نہ تھی۔ میرے نزدیک کسی پاک باز عورت کا مقروض ہونا تو اس سے بھی بُری بات تھی۔ میرا تامل مسٹر ڈی پونٹوری کے دلائل کے

سامنے نہ ٹھہر سکا۔ بھوکے مرنے کا خوف، ان خوشیوں کے خیال کہ جن کا سفر کے آغاز میں، میں نے خود سے وعدہ کیا تھا اور کسی اچھی صورتحال کے خیال نے مجھے مجبور کر دیا اور میں نہ چاہتے ہوئے بھی اینسی کی طرف روانہ ہو گیا۔ میں بآسانی ایک دن میں وہاں پہنچ سکتا تھا لیکن چونکہ مجھے وہاں پہنچنے کی کوئی جلدی نہ تھی اس لیے مجھے اس میں تین دن لگے۔ میرے ذہن میں دلچسپ لمحات کے خیالات بھرے ہوئے تھے اور جب بھی میں کسی آبادی کے نزدیک پہنچتا تو ان کے پورے ہونے کی ترنگ میرے دل میں پیدا ہوتی۔ میں اتنا بزدل تھا کہ کسی کے دروازے پر دستک نہ دیتا، یہاں تک کہ کھلے دروازے میں داخل بھی نہ ہو سکتا تھا۔ لیکن میں جو کر سکتا تھا' وہ میں نے کیا اور وہ یہ کہ جو کھڑکیاں مجھے موزوں لگیں ان کے نیچے کھڑا ہو کر میں گاتا رہتا لیکن میں یہ جان کر بہت پریشان ہوا کہ میری اس محنت کا کسی پر کوئی اثر نہ ہوا۔ نوجوان اور نہ ہی بوڑھی خواتین میرا گانا سن کر متاثر ہوئیں، نہ ہی کسی نے میری شاعری پر توجہ دی' اگرچہ میرے ساتھیوں نے مجھے کچھ گانے سکھائے تھے کہ جو میرے خیال میں بہت زبردست تھے اور جنھیں میں بہت شوق سے گاتا تھا۔ بالآخر میں اینسی پہنچ گیا اور وہاں میں نے میڈم ڈی ورین کو دیکھا۔

چونکہ میری زندگی کا یہ حصہ بہت حد تک میرے کردار کی وضاحت کرتا ہے سو میں اس کو اتنی آسانی سے نہ گزرنے دوں گا۔ میں اپنی زندگی کے سولہویں سال کے وسط میں تھا' اگرچہ میں اتنا خوبصورت تو نہ تھا لیکن اپنے قد کے لحاظ سے میرا جسم ٹھیک ٹھاک تھا۔ میری ٹانگیں ٹھیک ٹھاک تھیں۔ میری شکل وصورت ٹھیک ٹھاک اور چہرہ بھی مناسب تھا۔ میرے بال اور بھنویں کالی تھیں۔ میری آنکھیں تو چھوٹی اور اندر کو دھنسی ہوئی تھیں لیکن وہ میری زندہ دلی کا ثبوت دیتی تھیں۔ ان میں وہ جذبہ تھا جو میرے خون کو جلاتا تھا۔ بدقسمتی سے مجھے خود ان تمام چیزوں کا علم نہ تھا۔ میں نے کبھی خود پر غور نہ کیا تھا اور جب کیا تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ میری عمر کے لوگوں میں یہ شرم قدرتی خیر خواہی کی وجہ سے بڑھ جاتی ہے اور یہ مجھے کسی کو تکلیف دینے سے ڈراتی تھی۔ گو میرا ذہن کچھ مہذب ہو چکا تھا لیکن چونکہ میں نے ابھی دنیا نہ دیکھی تھی سو مجھے نرم لہجے اور اپنے ذہنی اکتساب کے بارے میں کچھ نہ معلوم تھا۔ بجائے اس کے کہ یہ میری اس کمزوری کی توجیہہ کرتا —— یہ صرف مجھے اپنی ہر کمزوری کا احساس دلا کر شرمندہ کرتا تھا۔

سو میں نے ظاہری شکل وصورت پر کم اعتبار کرتے ہوئے اپنی توجہ دوسری چیزوں کی طرف موڑ لی تھی۔ میں نے ایک تفصیلی خط لکھا جس کے مضمون کو میں نے تمام ادھار لی ہوئی کتابوں، چنے ہوئے پھولوں اور لفظوں سے سجایا۔ میرا مقصد اپنی طرف توجہ دلانا اور میڈم ڈی ورین کی خیر خواہی

تھا۔ میں نے اس میں مسٹر ڈی پونٹویری کا خط خوف اور اُمید سے بھرے دل سے ڈال دیا۔ یہ 1728ء کا پام سنڈے (ایسٹر سے قریب ترین اتوار) تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ وہ اس وقت چرچ گئی ہوئی ہیں۔ میں جلدی جلدی ان کے پیچھے گیا اور ان سے آگے نکل کر ان سے بات کی۔ وہ جگہ اب بھی میری یادوں میں تازہ ہے۔ اس کے علاوہ ہو بھی کیا سکتا تھا۔ اکثر میں نے اس (جگہ) کو چوما ہے اور اپنے آنسوؤں سے اسے گیلا کیا ہے۔ آخر میں اس اچھی جگہ کو سونے میں لپیٹ کر کیوں نہیں رکھ سکتا اور اسے سب کے لیے عزت کا مقام کیوں نہیں بنا سکتا؟ جو کوئی بھی اس جگہ کو دیکھنا چاہے جہاں جا کر انسان کو نجات مل سکتی ہے، اسے وہاں اپنے گھٹنوں کے بل آنا چاہیے۔

یہ گھر کے پیچھے ایک راستہ تھا جس کے دائیں جانب ایک نالا بہتا تھا جو اسے باغ سے جدا کرتا تھا۔ دائیں جانب برآمدے کی دیوار کے ساتھ آخر میں ایک دروازہ تھا جو Cordeliers کے چرچ میں نکلتا تھا۔ میڈم ڈی ورین دروازے کے آگے سے گزر رہی تھیں جب انھوں نے میری آوازیں سنیں تو فوراً رک گئیں۔ ان کو دیکھ کر مجھ پر کیا اثر ہوا! میرا خیال تھا کہ وہ ایک زاہدہ اور بدصورت سی بڑی عمر کی خاتون ہوں گی کہ مسٹر ڈی پونٹویری کی بتائی ہوئی نیک اور لائق خاتون ایسی ہی ہو سکتی تھی لیکن میں نے دیکھا کہ وہ ایک خوبصورت شکل والی خاتون تھیں۔ ان کی نیلی آنکھیں بہت پیاری تھیں اور رنگ اتنا سفید تھا کہ آنکھیں چندھیا جاتی تھیں۔ ان کی صراحی جیسی گردن دل موہ لیتی تھی۔ ایک نئے مذہب پر ایمان لانے والے کی نظروں سے کچھ بچ نہ پاتا تھا کہ اس لمحے میں اس کا تھا! ایک مذہب جس کے مبلغ ایسے (خوبصورت) ہوں وہ یقیناً جنت میں لے جاتا ہوگا۔

میں نے کانپتے ہاتھوں سے انہیں خط پیش کیا جسے انھوں نے ایک مسکراہٹ کے ساتھ قبول کیا۔ اسے کھول کر انھوں نے ایک نظر مسٹر ڈی پونٹویری کے خط پر ڈالی اور پھر سے میرا خط کھول کر تفصیل سے پڑھا۔ شاید وہ اسے ایک بار پھر پڑھتیں لیکن اسی لمحے ان کے ملازم نے ان کی سروس شروع ہونے سے ان کو آگاہ کیا۔ انھوں نے مجھے ایک کھنکھتی ہوئی آواز میں کہا ”بچہ! تم اس عمر میں اِدھر اُدھر پھر رہے ہو، کتنے افسوس کی بات ہے“۔ اور پھر میرے جواب کا انتظار کیے بغیر کہنے لگیں ”میرے گھر چلے جاؤ ان سے کہنا کہ تمہیں کچھ کھانے کو دیں، میں Mass (مذہبی دعا) کے بعد تم سے بات کروں گی“۔

ورین کا ایک معزز اور پرانا خاندان تھا جو ویوائے میں تھا جو ملک Vaudois کا ایک شہر تھا۔ کم عمری میں ان کی شادی کسی مسٹر ڈی ورین نامی شخص سے ہو گئی تھی جو House of Loys سے تعلق رکھتے تھے، وہ مسٹر ڈی ولارڈین کے سب سے بڑے بیٹے تھے اور لوسانا میں رہتے تھے۔ ان

کی کوئی اولاد نہ تھی اور ان کی شادی بھی اتنی کامیاب نہ تھی۔ کسی گھریلو پریشانی کی وجہ سے میڈم ڈی دیرن نے جھیل کے پار جانے کا فیصلہ کیا اور خود کو Victor Amadens کے قدموں میں گرادیا جو اس وقت Evian میں تھا۔ غرضیکہ انھوں نے اپنے خاوند، خاندان اور ملک کو بغیر سوچ سمجھے ___ چھوڑ دیا جس کی وجہ سے میں بھی اپنا سب کچھ چھوڑ آیا تھا۔ اس جلد بازی میں کیے گئے فیصلے پر انہیں بھی میری طرح پچھتاوا تھا۔

بادشاہ جو کہ چاہتا تھا کہ لوگ اسے کیتھولک کا ایک سرگرم کارکن سمجھیں' نے انہیں اپنی تحویل میں لے لیا۔ اس نے انہیں پائیڈمونٹ کے پندرہ ہزار لیورز پنشن کے طور پر دیے جو کہ ایک بڑی رقم سمجھی جاتی تھی کیونکہ بادشاہ بہت کم فیاضی کا مظاہرہ کرتا تھا۔ اس کی اس سخاوت سے یہی سمجھا جاتا تھا کہ اس کے دل میں اس خاتون کے لیے محبت تھی۔ اس نے انہیں اپنے محافظوں کی نگرانی میں اینسی بھجوایا جہاں مائیکل جبریل ڈی برناکس جسے جنیوا کا ایک بشپ کہا جاتا تھا کی نگرانی میں انھوں نے Convert of Visitations میں اپنا پرانا مذہب ترک کردیا۔

میں اس کے چھ سال بعد اینسی آیا۔ وہ 1700ء میں پیدا ہوئی تھیں اور اس وقت اٹھائیس برس کی تھیں۔ ان کی خوبصورتی ان کی شکل وصورت سے زیادہ ان کے جذبات میں ان کے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے نمایاں ہوتی تھی۔ یہ ان کے طور طریقے میں نظر آتی تھی جو دوسروں کو بہت سکون پہنچاتے تھے۔ ان کے نازک ہونٹوں پر ہر وقت ایک مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی۔ وہ اپنے بالوں (جن کا رنگ راکھ جیسا تھا اور وہ دوسروں سے بہت الگ اور خوبصورت تھے) کا خیال نہ رکھتی تھیں جو اُن کو مزید دلچسپ بنا دیتے تھے۔ ان کا قد چھوٹا تھا اور اپنے قد کے اعتبار سے ان کا وزن زیادہ تھا اگرچہ وہ قابل قبول تھا۔ کیونکہ اس سے زیادہ خوبصورت چہرہ کوئی اور نہ ہوسکتا تھا اور ان کی خوبصورت گردن اور ہاتھ بہت خوبصورتی سے بنائے گئے تھے۔

انھوں نے مختلف ذرائع سے تعلیم حاصل کی تھی۔ میری طرح انھوں نے بچپن میں ہی اپنی ماں کو کھو دیا تھا اور جب موقع ملا تعلیم حاصل کرلی تھی۔ انھوں نے کچھ چیزیں اپنی آیا سے سیکھیں، کچھ اپنے والد سے' کچھ اپنے اساتذہ سے لیکن مکمل تعلیم اپنے عاشقوں سے حاصل کی خاص طور پر ایک مسٹر ڈی ٹاول نامی شخص سے جس کے پاس ذوق اور معلومات دونوں تھیں اور وہ ان کے ذہن کو (جسے وہ پیار کرتا تھا) ان دونوں سے آراستہ کرتا تھا۔ ان تمام تعلیمات میں چونکہ ربط نہ تھا اس لیے وہ ایک دوسرے پر حاوی ہوجاتی تھیں جس کی وجہ سے ان کے اندر وہ بہتری نہ آسکی تھی جس کی قدرتی طور پر ان کے اندر گنجائش تھی۔ انہیں فلسفے اور طب کا تھوڑا علم تھا لیکن یہ ان کے اپنے والد

سے سیکھے ہوئے تجربہ کاری اور علم کیمیا کے شوق پر حاوی نہ ہو سکے تھے۔ وہ شربت، رنگ اور مرہم بناتیں اور یہ ظاہر کرتیں کہ انہیں بہت سی تراکیب معلوم ہیں۔

اگر چہ ان کی تعلیم کا جسے وہ غلط استعمال کر رہی تھیں، کچھ بدبختوں نے خوب فائدہ اُٹھایا (ان کی سمجھ بوجھ کو تباہ کرنے کے لیے) لیکن ان کے دل میں ملائمت اور ملنساری، بدقسمتوں کے لیے نرم دلی، نہ ختم ہونے والی سخاوت، زندہ دلی اور بے تکلفی برقرار تھی اور وہ کسی میں تفریق نہ کرتی تھیں۔ بڑی عمر میں جب ان پر مصیبتیں نازل ہوئیں تو مفلسی نے ان کی ان عادات کو مزید تراش دیا تھا۔ ان کی طبیعت کے اس ٹھہراؤ نے ان کے اچھے دنوں کی بے فکری کو ان کی زندگی کے آخری لمحوں تک قائم رکھا۔

ان کی غلطیاں ان کی نہ ختم ہونے والی سرگرمیوں کا نتیجہ تھیں، جن کی وجہ سے وہ ہر وقت حرکت میں رہتی تھیں۔ انہیں اپنی صنف کی رسمی باتوں میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ دوسرے کاموں کے لیے بنائی گئی تھیں اس لیے وہ ہمہ وقت ان کاموں کی کھوج میں لگی رہتی تھیں۔ اپنی موجودہ حالت میں وہ محض ایک معمولی سی عورت تھیں لیکن اگر میڈم ڈی لانگوویلی کو ان کا صحیح مقام دیا جاتا تو وہ ایک ریاست پر حکومت کر سکتی تھیں۔ ان کی قابلیت ان کی قسمت سے میل نہ کھاتی تھی۔ جس چیز کی وجہ سے انہیں اونچے حلقوں میں اعلیٰ مقام مل سکتا تھا۔ وہی کام ان کی بربادی کا سبب بنے۔ جن کاموں میں انکی دلچسپی تھی وہ ان کے لیے اپنے خیالوں میں منصوبہ بندی کرتیں جس میں وہ چھوٹی چھوٹی تفصیلات کا خیال رکھتی تھیں۔ اس کے لیے وہ جو ذرائع استعمال کرتیں وہ ان کی قابلیت کی بجائے ان کے خیالات کے حساب سے موزوں ہوتے۔ جن لوگوں پر ان کا انحصار تھا ان کی بدانتظامی کی وجہ سے وہ ناکام ہو جاتیں۔ ان کی جگہ کوئی دوسرا شخص ہوتا تو وہ صرف ناکام ہوتا لیکن وہ تو بالکل برباد کر دی گئیں تھیں۔ ان کی محنتی طبیعت نے انہیں کئی مصیبتوں میں ڈالا تھا جس سے انہیں ایک فائدہ بھی پہنچتا تھا اور وہ یہ کہ اس نے انہیں اپنی بقیہ زندگی اس خانقاہ میں پناہ لینے سے باز رکھا تھا جس کے بارے میں وہ سوچتی تھیں۔ ایک گوشہ نشینی کی اس سادہ اور یکساں زندگی اور وہاں کے خلوت خانوں میں کی جانے والی چھوٹی چھوٹی سازشیں اور بکواس ایسے عملی ذہن کے لیے موزوں نہ تھے، جو ہر روز نئے منصوبے بناتا تھا اور اسے ان کو تکمیل تک پہنچانے کی آزادی بھی تھی۔

برنکس کا پادری ایک اچھا انسان تھا، اس میں عقل تو سیلز کے فرانسس سے کم ہی تھی لیکن وہ کئی باتوں میں اس سے مشابہت رکھتا تھا۔ میڈم ڈی ویرن جنہیں وہ پیار سے بیٹی کہتا تھا وہ کئی چیزوں میں میڈم ڈی چانٹل ہی کی طرح تھیں۔ اس سے مشابہت کو وہ ان ہی کی طرح دنیا سے کنارہ کشی کر

کے ہی بڑھا سکتی تھیں اگر وہ کانونٹ کی بے کار زندگی سے متنفر نہ ہو گئی ہوتیں۔ یہ صرف ان کا جوش ہی نہ تھا جس نے اس ملنسار نو مذہب عورت کو اسقف (آرچ بشپ) کی ہدایات کے مطابق اپنے خلوص کا ثبوت دینے سے روک رکھا تھا۔ انھوں نے اپنا مذہب کسی بھی وجہ سے تبدیل کیا ہو لیکن ان جس چیز پر وہ ایمان لائی تھیں، اس کے ساتھ وہ پر خلوص تھیں۔ انہیں اپنا پرانا مذہب چھوڑنے کے کئی مواقع ملے ہونگے مگر وہ اس پر لوٹنا نہ چاہتی تھیں۔ وہ نہ صرف ایک اچھی کیتھولک تھیں بلکہ انھوں نے اپنی زندگی بھی اس کے مطابق گزاری۔ نہیں، بالکل نہیں! میں دعویٰ سے کہتا ہوں (اور میرا خیال ہے کہ مجھے ان کے دل کے راز جاننے کا موقع ملا تھا) کہ یہ ان کی انفرادیت سے نفرت ہی تھی جس نے انہیں کھلے عام اپنے زہد کا مظاہرہ کرنے سے روکے رکھا۔ مختصراً یہ کہ ان کی پارسائی میں اتنا خلوص تھا کہ وہ اس کو بناوٹ سے پاک رکھنا چاہتی تھیں۔ لیکن یہ ان کے اصولوں کو بیان کرنے کا موقع نہیں ہے، میں دوسرے موقعوں پر ان کے بارے میں بات کروں گا۔

جو لوگ روحوں کی غمگساری پر یقین نہیں رکھتے انہیں اپنے عقیدے چھوڑنے کی ہمت نہ ہوئی۔ میں عمر کے اس حصے میں تھا کہ ان کی طرح کی کوئی عورت جس میں سمجھ بوجھ ہوتی مجھے (اپنے پاس) رکھنے کے لیے بے تابی کا مظاہرہ نہ کر سکتی تھی۔

سو میرے معاملات کی دیکھ بھال کرنے والوں نے میری روانگی کا فیصلہ کیا۔ مجھے صرف ہاں کرنی تھی اور وہ میں نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے کر دی۔ میڈم ڈی ویرن جس جگہ تھیں وہاں سے جنیوا کی نسبت ٹیورن زیادہ دور تھا اور چونکہ وہ اس ملک کا دارلحکومت تھا، جہاں میں موجود تھا، اس لیے اس کا ایجنسی سے کسی ایسے شہر کی نسبت زیادہ تعلق تھا جہاں کوئی مختلف حکومت اور مذہب ہوتا۔ اس کے علاوہ جب میں نے انکی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے سفر کا آغاز کیا تو میں نے محسوس کیا کہ میں ان کے حکم کے تابع تھا، جو میری اُس علاقے کے لوگوں سے ناآشنائی سے زیادہ اچھی بات تھی۔ ایک لمبے سفر کا خیال میرے آوارہ گردی کے ناقابل شکست شوق کے ساتھ مل گیا، جس نے ابھی سے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا تھا۔ میری آنکھوں کو پہاڑوں کے درمیان کتنا اچھا محسوس ہو رہا تھا، خود کو Alps کی اونچائیوں پر چڑھ کر اپنے ساتھیوں سے بلند کرنے کا خیال کتنا اچھا تھا، جنیوا کے ایک شہری کے لیے دنیا دیکھنے کا خیال کتنا بڑا لالچ تھا، اس لیے میں نے اپنی رضامندی ظاہر کر دی تھی۔

جس نے اس سفر کا مشورہ دیا تھا، وہ دو دنوں بعد اپنی بیوی کے ہمراہ روانہ ہونے والا تھا۔ مجھے اس کی تحویل میں دے دیا گیا۔ وہ میرے محافظ بھی تھے، جس میں میڈم ڈی ویرن نے اضافہ کر

دیا تھا۔ وہ مجھے دی گئی رقم سے مطمئن نہ تھیں اس لیے انھوں نے رازدارانہ طور پر میری مالی امداد کی اور بہت سی ہدایات بھی دیں۔ ہم ایسٹر سے پہلے بدھ کو روانہ ہوئے۔

اگلے دن میرے والد اپنے ایک دوست مسٹر رائے ول کے ساتھ جو انہی کی طرح ایک گھڑی ساز تھا، اینسی پہنچے۔ وہ ایک عقل منداور پڑھا لکھا شخص تھا جو La Motte سے بہتر شاعری کرتا تھا اور اس سے بہتر بولتا بھی تھا۔ اس کی تعریف میں یہ بات بھی شامل تھی کہ وہ بہت سچا انسان تھا۔ لیکن اس کے ادب سے ذوق رکھنے کی وجہ سے اس کا ایک بیٹا مزاح نگار بن گیا تھا۔ انھوں نے پتہ لگایا کہ میں میڈم ڈی ویرن کے گھر تھا تو انھوں نے مجھ تک پہنچنے کی بجائے میڈم ڈی ویرن کی طرح میری قسمت پر افسوس کیا جبکہ وہ بآسانی مجھ تک پہنچ سکتے تھے (کیونکہ وہ گھوڑوں پر تھے اور میں پیدل تھا)۔

میرے چچا برنارڈ نے بھی یہی کیا وہ Consignon پہنچے اور یہ جان کر کہ میں اینسی جا چکا ہوں، فوراً واپس پلٹ گئے۔ سو میرے قریب ترین رشتے داروں نے میرے ستاروں کے ساتھ مل کر مجھے تباہی اور بدبختی کے حوالے کرنے کی سازش کی۔ میرے بھائی نے بھی اس بے پرواہی کا مظاہرہ کیا اور وہ پھر اس طرح کھو گیا کہ اس کا کچھ پتہ ہی نہ چل سکا۔

میرے والد نہ صرف ایک عزت دار بلکہ ایک سچے انسان تھے۔ وہ اس فراخ دلی سے رہتے تھے کہ اس کے نتیجے میں بہت سی اچھائیاں پیدا ہوئی تھیں۔ یہاں میں یہ بھی کہوں گا کہ وہ جس سے محبت کرتے اس کے لیے خاص طور پر بہت اچھے باپ تھے لیکن وہ ساتھ ساتھ اپنے مشاغل سے پیار کرتے تھے اور چونکہ ہم ایک دوسرے سے دور تھے تو دوسری چیزوں نے ان کی پدرانہ شفقت کو کم کر دیا تھا۔ انھوں نے نیان میں دوبارہ شادی کر لی تھی، اگرچہ ان کی دوسری بیوی اتنی زیادہ عمر کی تھی کہ ان کے ہاں مزید بچوں کا سوال تو نہ پیدا ہوتا تھا مگر ان کے کچھ رشتے دار تھے یوں سمجھیں میرے والد ایک دوسرے خاندان کے ساتھ منسلک ہو چکے تھے۔ ان کے اردگرد اور کئی چیزیں، کئی طرح کی محبتیں تھیں جو میرا خیال ان تک پہنچنے سے روکے رکھتی تھیں۔ وہ بوڑھے ہو چکے تھے اور بڑھاپے کی تکالیف کا مقابلہ کرنے کے لیے ان کے پاس کچھ نہ تھا۔ میری والدہ کی جائداد میرے بھائی اور مجھے وراثت میں مل چکی تھیں لیکن ہماری غیر موجودگی میں اس کا فائدہ میرے والد اُٹھاتے رہے تھے۔ میں یہ نہیں کہنا چاہتا تھا کہ اس خیال نے ان کے رویے پر فوری اثر ڈالا تھا مگر اس کا ایک نامعلوم سا اثر مزید ہوا تھا۔ اس نے انہیں مجھے واپس لانے کے لیے زور ڈالنے سے روکے رکھا۔ میرے خیال میں یہی وجہ تھی کہ اینسی تک میرا پتہ چلانے کے بعد وہ وہیں رک گئے جبکہ انہیں

یقین تھا کہ میں انہیں مل جاؤں گا۔ یہی وجہ اس وقت بھی ان کے پیش نظر تھی جب وہاں سے بھاگنے سے قبل میں ان سے کئی بار ملنے گیا تو وہ مجھ سے بہت شفقت سے پیش آتے مگر مجھے روکنے کی کوشش نہ کرتے تھے۔

ایک ایسا باپ جس کی محبت اور صفات کا میں قائل تھا کہ اس رویے نے میرے اپنے کردار پر ایسے اثرات مرتب کئے جس نے میرے دل کی صداقت قائم رکھنے میں بہت مدد کی۔ اس نے مجھے اخلاقیات کا وہ سبق دیا___ وہ (واحد) سبق جو ہمارے کردار پر ایسا جانا پہچانا اثر ڈالتا ہے (اور وہ یہ) کہ ہمیں ہمیشہ اپنے فرض کے مقابلے میں اپنے شوق کو اہمیت دینے سے بچنا چاہیے یا پھر دوسروں کی بدقسمتیوں سے اپنی خوشی حاصل کرنے کی پوری کوشش کرنی چاہیے، کیونکہ ہم جتنے بھی اچھے ہوں، ان حالات میں جلد یا بدیر نتیجہ سامنے آجاتا ہے۔ ہم اپنے مقاصد میں کتنے بھی صحیح ہوں نہ چاہتے ہوئے بھی غیر منصف اور بُرے بن جاتے ہیں۔

یہ اصول میرے ذہن میں اچھی طرح بیٹھ چکا تھا۔ اس نے دیر سے ہی سہی نہ صرف کھلے عام بلکہ اپنے جاننے والوں کے ساتھ اپنے روّیے کی نافہمی اور تلوّن مزاجی کو کم کرنے میں مدد دی۔ یہ کہا جاتا تھا کہ میں نئی چیزیں بیان کرتا ہوں اور میرا عمل دوسروں سے مختلف ہے۔ حالانکہ سچائی یہ ہے کہ میں انفرادیّت پسند ہوں اور نہ ہی اس کی تلقین کرتا ہوں۔ میرا مقصد صرف اچھا عمل کرنا اور ایسے حالات سے بچنا ہے جس میں میرے مقاصد کسی دوسرے شخص کی راہ میں حائل ہو جائیں اور مجھے نہ چاہتے ہوئے ایک ایسا راز مل جائے جو اس کو نقصان پہنچا سکتا ہو۔

دو سال قبل شاید مائی لارڈ مارشل میرا نام اپنی وصیّت میں ڈالتے جس سے بچنے کے لیے میں نے ہر ممکنہ کوشش کی تھی۔ میں نے انہیں پورا یقین دلایا کہ میں کسی بھی صورت کسی کی بھی اور خصوصاً ان کی وصیّت میں اپنا نام نہیں چاہتا۔ جس پر وہ اس سے باز آگئے مگر وہ بضد تھے کہ میں کم از کم ان کے زندہ رہنے تک ان سے سالانہ وظیفہ لیتا رہوں۔ جس کی میں نے حامی بھر لی۔ یہ کہا جائے گا کہ میں نے اس (تبدیلی) میں اپنا فائدہ تلاش کر لیا تھا لیکن وہ میرے محسن! میرے باپ! میں اب اس بات کو سمجھنے لگا ہوں کہ اگر میں آپ سے لمبی عمر پا سکتا تو میں کچھ نہ حاصل کر پاتا بلکہ اپنا سب کچھ کھو دیتا۔

میرے نزدیک یہ صحیح معنوں میں فلسفہ ہے۔ یہ انسان کی سچائی کی حد کو بیان کرتا ہے۔ ہر روز مجھے اس کی سچائی کا نیا ثبوت ملتا ہے۔ میں نے اس کے بعد لکھی ہوئی اپنی تمام تحریروں میں اس کا ذکر کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اکثریت اس کو سطحی طور پر لیتی ہے۔ اگر میں اپنی موجودہ تحریر پوری

کر کے دوسری شروع کرنے کے قابل ہو سکا___ میرا مطلب ہے ایمیلی کے ساتھ ساتھ کسی دوسری تحریر پر کام کر سکا تو میں اس اصول کی اتنی جاندار مثال دوں گا جسے ہر کوئی توجہ دے گا مگر ان سے کہیئے کہ اگر وہ اس بات کی وجہ بیان کر سکتے ہیں تو کریں کہ میڈم ڈی ورین کی پہلی نظر، پہلے لفظ نے مجھ پر ایسا اثر کیوں کیا کہ مجھے محبت اور لامحدود اعتماد کا احساس ہوا اور جس کی اب تک میں نے کوئی کمی محسوس نہیں کی۔ اگر اسے محبت کہیں (جس پر ہمارے اس رشتے کے اختتام کے بارے میں پڑھ کر شک کیا جا سکتا ہے)۔ آخر کیسے اس جذبے میں وہ احساسات جیسے سکون، اطمینان، تحفظ اور اعتماد شامل ہو سکتے ہیں جو آغاز سے اس رشتے کے ساتھ نہ جڑے ہوئے تھے۔ ایک ایسی خوش اخلاق اور مہذب عورت جس کا رتبہ مجھ سے بلکہ میں آج تک جس کسی سے بھی ملا تھا، سب سے اونچا تھا، جس پر کسی حد تک (اگر وہ اس میں دلچسپی لے تو) میرے مستقبل کا انحصار تھا۔ ایک ایسی عورت سے درخواست کرتے ہوئے میں کس طرح سکون محسوس کرتا ہوں جبکہ مجھے مایوس کرنے کے لیے کئی وجوہات موجود ہیں۔ مجھے ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے مجھے انہیں خوش کرنے کا موقع ملا ہو! کیوں مجھے ایک لمحے کے لیے بھی شرمندگی یا کسی رکاوٹ کا احساس نہیں ہوا؟ میں جو قدرتی طور پر شرمیلا انسان تھا، کسی بات پر آسانی سے پریشان ہو جاتا تھا، اور جس نے دنیا بالکل نہ دیکھی تھی۔ جب میں ان سے پہلی بار ملا اور انہیں دیکھا تو میں نرمی سے اور اپنے اس جانے پہچانے لہجے میں بات کر سکتا تھا کہ دس سال کی دوستی نے مجھے اتنی آزادی سکھا دی تھی۔ کیا ایسا ممکن ہے کہ بغیر کسی بے چینی اور جلن کو محسوس کیئے کسی کو پیار ہو جائے؟ میں یہ تو نہ کہوں گا کہ اس میں میری کوئی خواہش شامل نہ تھی کیونکہ ایسا نہ تھا۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ اگر ہمیں اپنی محبت کا بدلہ ملنے کی اُمید نہ ہو تو ہم بے چینی محسوس نہ کریں؟ لیکن میرے ذہن میں یہ سوالات نہ اُٹھے تھے۔ مجھے فوراً خود سے یہ پوچھنا چاہیئے تھا کہ کیا میں اپنے آپ سے محبت کرتا ہوں؟ نہ ہی انھوں نے کبھی بہت تجسس کا اظہار کیا تھا لیکن میرے (دل پسند) عورت کے ساتھ اس رشتے میں ایسی کوئی غیر معمولی بات ضرور تھی اور وہ اس کہانی کے اختتام پر پتہ چل جائے گی کیونکہ اس کے ساتھ کچھ فضولیات جن کا پہلے سے اندازہ نہیں تھا بھی جڑی ہوئی ہیں۔

اُس وقت سوال یہ تھا کہ میرے لیے کیا کیا جا سکتا تھا۔ مجھ سے کھل کر بات کرنے کے لیے انھوں نے میرے ساتھ کھانا کھایا۔ میری زندگی کا یہ پہلا موقع تھا جب مجھے بھوک کی ضرورت محسوس ہوئی، ان کے لیے بھی یہ پہلا موقع تھا۔ وہاں ان کی نگران خاتون___ بھی منتظر تھیں۔ انھوں نے بھی پہلی بار میری عمر اور حلیئے کے ایک مسافر میں اس کمی کو دیکھا تھا۔ ان کی اس بات نے

ان کی نگران خاتون کے مطابق مجھ پر کوئی (بُرا) اثر نہ ڈالا لیکن اس کا اثر اُس موٹے مسخرے پر ضرور ہوا جو کہ میرے ساتھ مہمان تھا اور چھ بندوں کے برابر کھانا کھا رہا تھا۔ میرا (دل) اتنا مگن تھا کہ مجھے کھانے کا ہوش ہی نہ تھا۔ میرے دل میں ایک لطیف احساس شروع ہوا جس نے آہستہ آہستہ میرے تمام جسم کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور کسی اور چیز کے لیے جگہ نہ بچی۔

میڈم ڈی ورین میرے بارے میں ہر ایک بات جاننا چاہتی تھیں۔ وہ تمام زندہ دلی جو میں اپنی ملازمت کے دوران کھو چکا تھا، لوٹ آئی اور میں نے انہیں ساری بات واضح کی۔ میری کہانی میں دلچسپی لینے کے ساتھ ساتھ اس معقول خاتون نے میری تقدیر پر افسوس بھی کیا جس کے حوالے، میں نے خود کو کر دینا تھا۔ یہ افسوس ان کے چہرے اور فعل سے صاف ظاہر ہو رہا تھا۔ وہ مجھے واپس جنیوا جانے کی نصیحت نہیں کر سکتی تھیں کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ ان کے قول اور فعل کو سختی سے جانچا جا رہا تھا اور ایسی کوئی نصیحت کیتھولک مذہب سے غداری سمجھی جائے گی لیکن وہ اس تکلیف کا ذکر صاف الفاظ میں کرتی تھیں جو میں اپنے والد کو دوں گا اور یہ صاف ظاہر تھا کہ اگر میں اپنے والد کی خاطر واپس جانا چاہتا تو وہ اس کو پسند کرتیں۔ آہ! انھوں نے یہ نہ سوچا کہ ان کے سامنے یہ دلیل کتنا کم وزن رکھتی تھی۔ جتنی شائستگی سے وہ مجھے اس کی ترغیب دیتیں میں خود کو ان سے دور کرنا اتنا ہی مشکل پاتا۔ مجھے معلوم تھا کہ جنیوا جانے کا مطلب میرے اور ان کے درمیان ایک نا قابل عبور رکاوٹ ڈالنا تھا یہاں تک کہ میں پھر سے وہی حرکت کرتا جو مجھے یہاں تک لائی تھی۔ اور ایسا کرنے سے بہتر تھا کہ میں یہیں رہتا۔ ان باتوں سے قطع نظر میرا عمل پہلے سے طے شدہ تھا۔ میں نے واپس نہ جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ میڈم ڈی ورین نے جب یہ دیکھا کہ ان کی کوششوں کا کوئی فائدہ نہیں ہو رہا تو انھوں نے صاف اور کھلے الفاظ میں بات کرنی کم کر دی۔ وہ ترس کھا کر بس اتنا کہتیں جہاں تمھیں تمہاری قسمت لے جائے تمہیں جانا چاہیے لیکن ایک دن تم میرے بارے میں سوچو گے میرا خیال ہے اس وقت انہیں علم نہ تھا کہ ان کی بات کتنی سچ ثابت ہو گی۔

مسئلہ پھر وہی تھا کہ میں کس طرح روزگار کماؤں؟ میں یہ جانتا تھا کہ مجھے نقش نگاری اتنی نہ آتی تھی کہ میں اسے ذریعۂ معاش بنا لیتا۔ اگر میں اس میں ماہر بھی ہوتا 'سیوائے' اتنا کنگال تھا کہ یہاں علم فنون کی حوصلہ افزائی نہ کر سکتے تھے۔ اوپر میں نے جس پیٹو کا ذکر کیا تھا جو اپنے ساتھ ساتھ ہمارے حصے کا بھی کھا رہا تھا، جب کھا کھا کر تھک گیا اور وقفہ لینے کے لیے رکا تو اس نے ایک مشورہ دیا جو اس کے خیال میں سیدھا جنت سے آیا تھا لیکن اس کے اثرات سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ

اس سے بالکل مختلف جگہ سے نازل ہوا تھا! اس کا کہنا تھا کہ مجھے ٹیورن جانا چاہئے جہاں مسیحی افراد کی اصلاح کے لیے ایک ہسپتال تھا۔ وہاں مجھے دینی اور دنیاوی دونوں طرح کی خوراک ملے گی۔ چرچ کے قریب رہ کر میں مفاہمت تو کرلوں گا اور مجھے کچھ خیر عیسائیوں سے بھی ملنا چاہئے کہ وہ میرے لیے کوئی بہتر حالات پیدا کرسکیں گے۔ اس کے علاوہ اس نے کہا کہ ''جہاں تک زادِراہ کا تعلق ہے تو اگر ایک بار میڈم نے اس نیک کام کی رائے دی تو وہ کھلے دل سے مدد کرنے میں پیچھے نہ ہٹیں گی اور ..........Madam, the Baroness'' کھانے کے دوران ایک بار پھر اس نے خود سے مخاطب ہو کر کہا ''جو اپنی سخاوت کے لیے مشہور ہیں، وہ ضرور مدد کریں گی''۔

میں ان تمام مہربانیوں سے کسی حال میں بھی خوش نہ تھا۔ میں نے کہا کچھ نہیں! یہ سوچ کر میرا دل دکھ سے پھٹا جا رہا تھا' میڈم ڈی ویرن بھی اس ترکیب سے اتنی خوش نہ تھیں جیسے کہ کوئی منصوبہ کار عام طور پر ہوتے ہیں۔ وہ صرف اتنا کہتیں کہ ہمیں دوسروں کو اچھے کاموں میں مشورہ دینا چاہئے اور وہ اس کا ذکر ''آں جناب'' سے کریں گی۔ لیکن وہ شیطان بار بار مداخلت کرتا تھا، اس کا شاید اس معاملے میں کوئی ذاتی مفاد تھا۔ وہ پوچھنے لگا کہ کیا وہ اس بات پر مجبور کریں گی۔ اس نے سرکاری شعبۂ خیرات کے کارکنان کو میری کہانی سے متعارف کروایا اور اس نے ان پادریوں پر اتنا دباؤ ڈالا کہ جب میڈم ڈی ویرن (جو میری وجہ سے اس سفر سے ناخوش تھیں) نے بشپ سے اس کا ذکر کیا تو انہیں پتہ چلا کہ اس کا فیصلہ تو ہو چکا ہے کیونکہ اس نے فوراً ان کے ہاتھ پر میرے زادِراہ کے لیے پیسے رکھ دیئے۔ انہیں اس کے خلاف کچھ کہنے پر وہ اسے اپنی طرف مبذول کرلے گی۔ لیکن میں نے ایک مسافر کی حیثیت سے (اس پر) کافی روشنی ڈال لی ہے' اب سفر کو آگے بڑھانے کا وقت آ گیا ہے۔

یہ میری اُمیدوں سے زیادہ (اچھا) نکلا۔ میرا جاہل ___ رہنما اتنا بھی بُرا نہ تھا جتنا میں اُسے سمجھتا تھا۔ وہ درمیانی عمر کا ایک آدمی تھا، اپنے کالے اور بھورے بالوں کی چوٹی بنا کر رکھتا تھا۔ وہ فوجیوں کی طرح رہتا تھا۔ اس کی آواز بھاری تھی اور وہ اچھا خاصا زندہ دل تھا۔ چونکہ وہ کوئی خاص ہنر نہ جانتا تھا سو اس کمی کو پوری کرنے کے لیے وہ اپنی تمام صلاحتیں استعمال کرتا تھا۔ اس نے میڈم ڈی ویرن کو اینسی میں کسی چیز کا کارخانہ لگانے کی تجویز دی تھی جو وہ فوراً مان گئی تھیں اور اب وہ ٹیورن جا کر پادری کے سامنے اپنی تجویز پیش کرنا چاہتا تھا اور ان سے منظوری لینا چاہتا تھا۔ اس نے اس بات کا خاص دھیان رکھا تھا کہ اس سفر کے لیے اُسے ٹھیک ٹھاک معاوضہ دیا جائے گا۔

اس مضحکہ خیز انسان کو پادریوں سے اپنی بات منوانا آتا تھا جن کی خدمت کرنے کے لیے وہ ہمہ وقت تیار رہتا تھا۔ اس نے ان کے ساتھ رہ کر ایک خاص زبان سیکھ لی تھی اور وہ خود کو ایک بڑا مبلغ سمجھتا تھا۔ اسے بائبل کا ایک پیرا لاطینی زبان میں بھی پڑھنا آتا تھا۔ اسی سے اس کا مقصد اس طرح پورا ہو جاتا تھا جیسے اسے ہزاروں پیرے یاد ہوں کیونکہ وہ اسے روزانہ ہزار بار دہراتا تھا۔ جب اسے معلوم ہوتا کہ کس جیب میں پیسے ہو سکتے ہیں تو اس کی اپنی جیب پھر کبھی خالی نہ رہتی تھی لیکن وہ مکار نہ تھا صرف ہوشیار تھا۔ جب وہ اپنی میٹھی زبان سے لاطینی میں گفتگو کرتا تو پیٹر دی ہرمٹ لگتا تھا، جو پہلو میں اپنی تلوار لئے جنگ کی نصیحت کر رہا ہو۔

اس کی بیوی میڈم صابرن ایک اچھی اور قابل قبول عورت تھی۔ وہ دن کی نسبت رات کو زیادہ پرسکون دکھائی دیتی تھی کیونکہ میں اسی کمرے میں سوتا تھا' جہاں وہ سوتی تھی۔ میں اکثر اس کے جاگنے سے پریشان ہو جاتا تھا اور اگر مجھے اس کی وجہ معلوم ہو جاتی تو شاید میں اور پریشان ہوتا لیکن میں اس معاملے میں اتنا کُند تھا کہ یہ بات مجھے صرف تجربے سے معلوم ہو سکتی تھی۔

میں خوشی خوشی اپنے نیک رہنما اور اس کے پُر امید ساتھی کے ساتھ چلتا رہا اور ہمارے سفر کو روکنے کے لئے کوئی منحوس حادثہ بھی نہ ہوا تھا۔ مجھے یاد نہیں پڑتا ہے کہ میں نے آج تک اتنا ذہنی اور جسمانی سکون پہلے کبھی محسوس کیا ہو۔ میں خود کو جوان، تندرست اور تحفظ سے بھرپور محسوس کرتا تھا۔ میں خود پر اور دوسروں پر (لامحدود) اعتماد محسوس کرتا تھا۔ انسانی زندگی کے اس مختصر لیکن دل پسند لمحے میں، جس کی وسیع طاقت (اگر مجھے اپنے خیال کا اظہار کرنے کی اجازت ہو تو) ہمیں احساسات کی اس بلندی تک لے جاتی ہے کہ تمام قدرت دل موہ لینے اور ناقابل بیان انداز میں خوبصورت نظر آتی ہے اور یہ خوبصورتی ہمارے شعور اور وجود کی بڑھتی ہوئی خوشی سے چھلکتی ہے۔

میری اس خوشگوار بے چینی کو اب ایک ___ مقصد مل گیا تھا اور اب یہ بے مقصد نہ رہی تھی۔ اب میں خود کو میڈم ڈی ویرن کا محنتی شاگرد، دوست اور (تقریباً ایک) عاشق سمجھتا تھا۔ انھوں نے مجھے خوش کرنے کے لیے جو باتیں کی تھیں وہ جس طرح مجھے پیار سے پکارتی تھیں، میرے سے تعلق رکھنے والی باتوں میں وہ جس طرح شوق سے دلچسپی لیتی تھیں، ان کی نظریں جو پیار سے چھلکتی محسوس ہوتی تھیں کہ وہ پیار کا پیغام دیتی محسوس ہوتی تھیں۔ سفر کے دوران ان کے خوبصورت ترین خیال میرے تصورات میں رہے جو کہ ظاہر ہے، مستقبل کے بارے میں میرے اندیشوں سے بھی متاثر نہ ہوئے۔ مجھے ٹیورن بھیجنے کا انکا یہی مقصد تھا کہ میں کوئی کام ڈھونڈ لوں۔ غرضیکہ میں اپنی پریشانیاں بھول کر آگے بڑھتا رہا جبکہ میرے ذہن میں ہر وقت نئی خواہشات، اُمیدیں اور روشن

امکانات جنم لیتے تھے جو میری آنے والی خوشحالی کی ضمانت دیتے تھے۔ مجھے ایسا لگتا تھا کہ ہر گھر خوشیوں سے بھرا ہوا ہے، میدان تماشیوں اور عیش و عشرت سے گونج رہے ہیں، دریا کا پانی فرحت بخش ہے۔ مچھلیاں اس میں آزادی سے تیرتی ہیں اور ان کے پھولوں سے بھرے کناروں پر گھومنا کتنا مسرور کن ہے۔ درخت بہترین پھلوں سے لدے ہیں اور ان کے سائے جوڑوں کو خفیہ پناہ گاہیں مہیا کرتے ہیں۔ پہاڑ، دودھ، بالائی، امن و سکون، سادگی اور خوشی سے بھرے ہوئے ہیں اور یہ سب ایک انجانی جگہ جانے کی خوشی کے ساتھ مل گئے تھے۔ میں جو چیز دیکھتا وہ میرے دل کو حرارت پہنچاتی تھی۔ (قدرت کی) یہ عظمت اور خوبصورتی یوں دل موہ لینے کی توجیہہ پیش کرتی تھی جس میں خودنمائی بھی اپنا حصہ لینے آئی تھی۔ اس عمر میں اٹلی جانا، اتنی تفصیل سے ان تمام علاقوں کو دیکھنا اور ایلپس میں ہنی بال کے راستے پر سفر کرنا۔ یہ سب مجھے اترانے پر مجبور کرتی تھی، اس میں ہمارا جگہ جگہ رکنا بھی شامل کرلیں۔ ایسے میں خوب بھوک لگتی تھی' کھانے کو بھی بہت کچھ تھا۔ ویسے بھی وہ بچانے کے قابل نہ تھا۔ میڈم صابرن کے دسترخوان پر کوئی چیز چھوڑی نہ جاسکتی تھی۔

اپنی پوری زندگی میں، میں نے خود کو کبھی اتنا بے پرواہ نہیں محسوس کیا جتنا میں نے ان سات، آٹھ دنوں میں کیا جو میں نے اینسی سے ٹیورن کی طرف سفر میں گزارے۔ چونکہ ہم میڈم صابرن کی رفتار سے چلنے پر مجبور تھے اس لیے ہمیں یہ ایک تھکا دینے والے سفر سے زیادہ سیر و تفریح لگتی تھی۔ میرے ذہن پر اب بھی خوشگوار یادیں موجود ہیں اور اُس وقت سے مجھے (خاص طور پر پہاڑوں میں) پیدل چلنا اچھا لگتا ہے۔ جس دن میں بہت خوش ہوتا' پیدل چلتا تھا اور مجھے اس سے ناقابل بیان خوشی ملتی تھی۔ بعد میں جب مجھے کام کوئی ہوتا اور میرے پاس (بھاری) سامان ہوتا تو مجھے ایک شریف انسان کی طرح سواری لینا پڑی اور پھر مجھے پریشانی، شرمندگی اور روک ٹوک بھی ہوتی۔ مجھے سفر سے لطف اُٹھانے کے بجائے بس منزل پر پہنچنے کی جلدی ہوتی۔

میں کافی عرصہ پیرس میں رہا۔ اس دوران میں ایسے دو ساتھیوں کی تلاش میں رہا جو (میرے ساتھ) پچاس Guiness اور اپنی آدھی جائداد کے بدلے میرے ساتھ اٹلی کا سفر کرنے کو تیار ہوں۔ اس سفر میں ہمارے ساتھ صرف ایک چھوٹا لڑکا ہوتا جو ہمارا سامان سنبھالتا۔ مجھے ایسے کئی لوگ ملے جنھیں یہ خیال بہت دلچسپ لگتا اور وہ اسے بس ایک خیال ہی سمجھتے جس کے بارے میں بات تو کی جاسکتی تھی لیکن عملی جامہ پہنانے کو کوئی تیار نہ تھا۔ ایک دن جب میں بہت زور و شور سے ڈائڈراٹ اور گرم سے اس بارے میں بات کر رہا تھا' انھوں نے اتنی گرمجوشی سے اس بات پر اقرار کیا کہ مجھے لگا کہ بس فیصلہ ہو گیا ہے لیکن یہ صرف ایک کاغذی سفر ثابت ہوا جس میں

ڈائڈراٹ کے بارے میں لغو باتیں کرنے کے علاوہ ۔گرم کے پاس اور کوئی بات نہ تھی اور اس دوران انھوں نے مجھے اپنے بارے میں تحقیقات کرنے سے روک دیا۔

میرے ٹیورن جلدی پہنچ جانے کا دکھ، اتنا بڑا شہر دیکھ کر' وہاں ایک مشہور شخصیت سے ملنے کے خیال سے دور ہو گیا کیونکہ میرا ذہن ابھی سے اولوالعزمی سے مدہوش ہو چکا تھا۔ میں خود کو ایک ملازم سے زیادہ سمجھنے لگا تھا اور مجھے اس بات کا خیال نہ آیا کہ میرا درجہ شاید اس سے بھی نیچے تھا۔

اس سے پہلے کہ میں آگے بڑھوں میں اپنے قاری کو غیر دلچسپ واقعات کو بیان کرنے کی وجہ بیان کرنا چاہوں گا۔ اپنے اس ارادے کو' میں خود کو سب کے سامنے کھول دوں، کیونکہ تکمیل کے لیے ضروری ہے کہ کوئی بات بھی راز نہ رہے۔ میں ہر وقت قاری کے سامنے رہنا چاہتا ہوں۔ (میں چاہتا ہوں کہ) وہ میرے دل کی تمام آوارہ گردویوں میں میرے ساتھ رہے۔ میری مہمات کے اس الجھاؤ میں اسے میرے متعلق کہیں کوئی خلا محسوس نہ ہو، نہ ہی میں ایک لمحے کے لیے بھی اس کی آنکھوں سے اوجھل ہوں کہ اسے یہ کہنے کا موقع ملے کہ میں فلاں لمحے کیا کر رہا تھا۔ اسے مجھ پر یہ شک نہیں ہونا چاہئے کہ میں کسی بات کو بیان کرنے کی ہمت نہیں کر سکا۔ جو کچھ میں کہتا ہوں اس میں اتنا بغض ہے کہ (کسی بات پر) خاموش رہ کر میں اس میں اضافہ کرنا غیر ضروری سمجھتا ہوں۔

میرے سارے پیسے ختم ہو چکے تھے یہاں تک کہ وہ بھی جو مجھے خفیہ طور پر میڈم ڈی ویرن سے ملے تھے۔ میں نے اس راز کو راز رکھنے کی کوئی کوشش نہ کی جس سے میرے ساتھیوں نے بھرپور فائدہ اُٹھایا تھا۔ میڈم صابرن کے پاس مجھے میری ہر چیز سے محروم کرنے کے کئی طریقے تھے یہاں تک کہ وہ ربن جس پر چاندی (کے دھاگے) سے کڑھائی کی گئی تھی اور جس سے میڈم ڈی ویرن نے میری تلوار کے دستے کو آراستہ کیا تھا۔ اس کا مجھے سب سے زیادہ افسوس تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ وہ تلوار بھی میں شاید کھو دیتا اگر اسے اپنے پاس رکھنے پر بضد نہ ہوتا۔ یہ سچ ہے کہ اس سفر میں انھوں نے مجھے سہارا دیا تھا لیکن اس (سفر) کے آخر میں میرے پاس کچھ نہ بچا تھا۔ جب میں ٹیورن پہنچا تو میرے پاس پیسے یا کپڑے بھی نہ تھے۔ میں اب اس حالت میں تھا کہ مجھے جو کام ملنے والا تھا اس میں میرے پاس اپنی قابلیت کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ میں نے سب سے پہلے اپنے ذمے لگائے گئے خطوط اپنی جگہ پہنچانے کا کام کیا۔ اب مجھے نومسیحی افراد کے ہسپتال میں کام پر لگایا گیا تاکہ میں اس مذہب کی تعلیمات سیکھ سکوں جس کے بدلے مجھے تنخواہ ملنی تھی۔ وہاں داخل ہونے کے لیے مجھے ایک لوہے کے دروازے سے گزرنا پڑا۔ یہ آغاز کسی بھی طرح میری آئندہ

صورتحال کے بہتر ہونے کی دلیل نہ بنتا تھا۔ پھر مجھے ایک بڑے کمرے میں لے جایا گیا جس کے فرنیچر میں لکڑی کا ایک میز (جو کہ روزانہ ایک کونے میں پڑا رہتا تھا) شامل تھا اور جس پر ایک بڑی سی صلیب پڑی تھی۔ اس کے گرد اُسی لکڑی کی کئی ہلکی سی کرسیاں پڑی تھیں۔ اس ہال میں چار یا پانچ بڑی سی Banditti اکٹھی کر کے رکھی گئی تھیں، جو میرے ساتھی! جنت کے امیدواروں کی بجائے دوزخ کے ایماندار خدمت گاروں کے لیے بنائی گئی تھیں۔ ان میں سے دو Sclavnians تھے لیکن خود کو افریقی یہودی بتاتے تھے اور (جیسا کہ انھوں نے مجھے یقین دلایا تھا) وہ سپین اور اٹلی سے بھاگ کر آئے تھے۔ انھوں نے عیسائیت اختیار کر لی تھی اور جہاں وہ مناسب سمجھتے تھے انہیں بپتسمہ (تبدیلی مذہب پر ادا کی جانے والی ایک رسم) کر دیا گیا تھا۔

اس کے بعد انھوں نے لوہے کا دوسرا دروازہ کھولا جو برآمدے میں کھلنے والی بالکونی کو تقسیم کرتا تھا۔ اس کے بعد ہم اس ہسپتال کے دوسرے حصے میں داخل ہوئے جسے میری طرح دوسرا جنم ملا تھا لیکن وہ میری طرح عیسائیت نہ اختیار کر رہا تھا بلکہ اسے ترک کر رہا تھا۔ ذلیل، گندی اور وہ کسبیاں جنھیں چھوڑ دیا گیا تھا، وہاں موجود تھیں۔ ان میں ایک البتہ کافی خوبصورت اور دلچسپ تھی۔ وہ شاید میری ہی عمر کی ہوگی یا شاید ایک یا دو سال بڑی ہوگی۔ اس کی دو شرارتی آنکھیں بار بار میری آنکھوں سے ٹکراتی تھیں۔ یہ میرے اندر خواہش جگانے کے لیے کافی تھا کہ میں اس سے جان پہچان بڑھاؤں۔ لیکن وہ اُس معتبر ادارے کی نگران خاتون کی کڑی نظروں میں تھی، جو اُسے عیسائیت کے دائرے میں داخل کرانے کے لیے جوش و خروش سے محنت کر رہی تھی۔ وہ نیک خاتون اتنی سختی سے اس پر نگرانی رکھتی تھی کہ دو مہینے جو ہم نے اس گھر میں اکٹھے گزارے (جہاں وہ پہلے ہی تین مہینے گزار چکی تھی) مجھے اس سے بات کرنے کا بمشکل ہی موقع ملا یا تو وہ بہت بے وقوف تھی اور شکل سے ظاہر نہ کرتی تھی کیونکہ کسی کو کبھی اتنے لمبے عرصے کے لیے اصلاح کے لیے نہ رکھا گیا تھا۔ اس لڑکی سے حلف لینے کے لیے اس نیک بندے کو کبھی موزوں موقع نہ ملتا تھا۔ اس دوران وہ (لڑکی) ان محرابوں والے گھر سے تنگ آ گئی اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ چاہے مذہب کوئی بھی ہو اب مزید وہاں نہ رہے گی اور انہیں اس کی بات ماننا پڑی کہ وہ کہیں سرکشی نہ اختیار کر لے اور وہ وہاں سے اتنی ہی گناہ گار نہ جائے جیسے وہ آئی تھی۔

یہ تمام لوگ نئے آنے والے کے استقبال کے لیے جمع ہوئے تھے۔ جب ہمارے رہنما نے ہمیں ایک مختصر سا وعظ دیا۔ مجھے کہا گیا تھا کہ میں خدا کی طرف سے دی گئی اس نعمت پر اپنی فرمانبرداری کا اظہار کروں۔ باقی لوگوں کو ہدایات دی گئی تھیں کہ وہ میری عبادات میں میری مدد

کریں اور میری اخلاقی اصلاح کے لیے اپنے آپ کو مثال بنائیں۔ پھر کنواریاں (Virgins) اپنے اپنے کمروں میں چلی گئیں اور مجھے میری جگہ پر تسلی سے سوچنے کے لیے چھوڑ دیا گیا۔

اگلی صبح ہمیں پھر وعظ کے لئے جمع کیا گیا۔ اب میں نے پہلی بار اپنے اس فیصلے اور ان حالات، جنھوں نے مجھے اس راہ پر ڈالا، کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔

اپنے اس دعویٰ کو جس کا ذکر میں پہلے بھی کر چکا ہوں' میں شاید بار بار دہراؤں گا' جس پر میرا یقین دن بدن بڑھتا جاتا ہے' اور وہ یہ کہ اگر کسی بچے کو کبھی (کوئی) معقول اور اچھی تعلیم دی گئی تھی ___ تو وہ میں تھا۔ میں ایک ایسے خاندان سے تھا جس کی اخلاقیات ناقابل اعتراض تھیں اور میرا ہر سبق احتیاط اور نیکی کے اصولوں پر مبنی ہوتا تھا۔ میرے والد (اگر چہ وہ بہت عاشق مزاج انسان تھے) نہ صرف بہت دیانت دار تھے بلکہ دیندار بھی تھے۔ دنیا کو وہ ایک بے فکرے انسان نظر آتے تھے لیکن اپنے خاندان کے لیے وہ پکے عیسائی تھے۔ انھوں نے بچپن میں ہی میرے ذہن میں وہ خیالات بٹھا دیئے تھے جنھیں وہ ضروری سمجھتے تھے۔ میری تین خالائیں بہت نیک خواتین تھیں۔ ان میں سے بڑی دو بہت ہی عابدہ قسم کی خواتین تھیں اور تیسری جن میں عقل و فراست بھی تھی، میرے خیال میں وہ سب سے زیادہ مذہبی عورت تھیں اگر چہ ان میں دکھاوا دوسروں سے کم تھا۔ ایسے خاندان (کے بیچ) سے مجھے مسٹر لیمبر سائز کے پاس بھیج دیا گیا جو کہ منسٹری (اہل کلیسا) سے گہرا تعلق رکھتے تھے۔ وہ جو سکھاتے اس پر یقین بھی رکھتے تھے اور اس کے اصولوں پر عمل کرتے تھے۔ وہ اور ان کی بہن دونوں نے اپنی اپنی تعلیمات کی بناء پر نیکی کے اصولوں کی بنیاد رکھی تھی جو میں پہلے ہی سیکھ چکا تھا۔ ان اچھے لوگوں نے اس کے لیے اتنے موزوں طریقے استعمال کئے تھے کہ جس سے نتائج ان کی مرضی کے مطابق نکلتے تھے۔ میں ان کی باتیں سنتے ہوئے کم ہی تھکتا تھا۔ ان کی فہمائش سن کر مجھ پر اچھا اثر ہوتا تھا اور میں نیک زندگی گزارنے کا فیصلہ کرتا کہ میں بھی ایسی اچھی زندگی بسر کروں گا۔ مجھے اپنا یہ فیصلہ غفلت کے لمحوں کے علاوہ کبھی نہ بھولتا تھا۔ میرے انکل کے گھر میں مذہب ایک اکتا دینے والا معاملہ تھا کیونکہ وہ اسے ایک کام سمجھتے تھے۔ اپنے مالک کے پاس جہاں میں ملازمت کرتا تھا، میں نے اس بارے میں سوچنا چھوڑ دیا تھا اگر چہ میرے جذبات ویسے ہی تھے۔ میری اخلاقیات کو بگاڑنے کے لیے وہاں کوئی نہ تھا۔ وہاں میں فارغ، بے پرواہ اور ڈھیٹ ضرور ہو گیا تھا لیکن میرے اصول برقرار رہے۔

یوں سمجھیں میرے اندر بھی اتنا مذہب زندہ تھا جتنا ایک بچے کے اندر ہو سکتا ہے۔ تو اب میں کیوں اپنے خیالات کو چھپاتا؟ میں اپنے بچپن میں بھی بچہ نہ تھا۔ مجھے ایسا لگتا تھا کہ جیسے میں

ایک (جوان) آدمی ہوں۔ جیسے جیسے میں بڑا ہوتا گیا' تمام لوگوں میں گھل مل گیا مگر بچپن میں، میں خود کو ان سے مختلف سمجھتا تھا۔ اس عجیب سی بات کے اظہار کے بعد یقیناً میں نے خود ہی اپنے آپ کو تضحیک کے لیے پیش کر دیا ہے۔ لیکن میں مطمئن ہوں۔ وہ لوگ جنھیں اس بات پر ہنسی آئے، انہیں جی بھر کے ہنسنے دیجئے، پھر انہیں یہ سوچنے دیجئے کہ ایک چھ سال کا بچہ جس کے لیے رومان بیک وقت ایک خوش کن، دلچسپ اور متاثر کن جذبہ تھا یہاں تک کہ (کسی کے) آنسو بھی اس کو متاثر کر دیتے تھے پھر مجھے اپنی اس عجیب و غریب خودنمائی کا احساس ہوگا اور میں خود کو قصور وار سمجھوں گا۔

سو جب میں یہ کہتا ہوں کہ اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ (ہمارے) بچے کوئی مذہب اختیار کریں تو ہمیں ان سے اس موضوع پر بات نہیں کرنی چاہئے اور جب میں یہ دعویٰ کرتا ہوں کہ وہ اس اعلیٰ ذات ___ سے اپنے دل کی بات کرنے کے قابل نہیں ہوئے تو میں یہ باتیں اپنے اپنے مشاہدوں کی بنیاد پر کہتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ باتیں کچھ خاص معاملات میں لاگو نہیں ہوتیں۔ آپ چھ سال کے جے جے روسو کو تلاش کریں، پھر سات سال کی عمر میں ان سے مذہب پر گفتگو کریں اور میں یہ جانتا ہوں کہ اس میں کوئی خطرے والی بات نہ ہوگی۔

میرے خیال میں یہ بات سب جانتے ہیں کہ ایک بچہ یا آدمی جس مذہب پر پیدا ہوتا اور جس کی اسے تعلیم دی جاتی ہے، اسے برقرار رکھنے کی وہ خلوص دل سے کوشش کرتا ہے۔ اس سے دور ہونے کی کوشش تو وہ اکثر کرتا ہے لیکن اس میں تبدیلی لانے کی کوشش وہ کم ہی کرتا ہے۔ راسخ العقیدی انسان میں تعلیم کی وجہ سے آگئی ہے۔ اس عام اصول کے علاوہ جس نے کہ مجھے اپنے آباؤ اجداد کے مذہب پر قائم رکھا تھا، میرے اندر ایک کیتھولک کی وہ خاص نفرت بھی تھی جو ہمارے شہر میں عام تھی۔ وہاں یہ ایک بڑی بت پرستی کی نشانی تھی اور اس کے پادری سب سے زیادہ بُرے سمجھے جاتے تھے۔ یہ خیال میرے ذہن میں اتنا پختہ ہو چکا تھا کہ میں نے کبھی ان کے چرچ میں جھانکنے کی بھی کوشش نہیں کی۔ میں کسی پادری کو اس کے (روایتی) ڈھیلے ڈھالے سفید لباس میں ملنے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا اور عبادت کے لیے دی جانے والی گھنٹیوں کو سن کر میں خوف سے کانپ جاتا تھا۔ یہ احساسات بڑے بڑے شہروں میں جا کر کم ہو گئے تھے لیکن جب میں قصبے کے پادری کے پاس جاتا تو یہ لوٹ آتے کیونکہ یہ ان جگہوں سے ملتے جلتے تھے، جہاں مجھے اس کا پہلا تجربہ ہوا تھا۔ جبکہ اس ناپسندیدگی کے ساتھ مجھے جنیوا کے مضافات میں رہنے والے پادریوں کا وہاں کے بچوں سے پیار کرنے کا انداز بھی یاد تھا۔ اگر Viaticum کی گھنٹی مجھے ڈراتی تھی تو (Mass) صبح یا

شام کی عبادت (Vesper) کے لیے بجنے والی گھنٹی مجھے ناشتے کی خبر دیتی تھی ___ ایک ایسا ناشتہ جس میں تازہ مکھن، پھل اور دودھ ملتا تھا۔ مسٹر ڈی پونٹواری کی اچھی حسی و روحانی مسرت نے مجھ پر کافی اثر ڈالا تھا، میری پرانی چڑ ختم ہونے لگی تھی اور میں اب پاپائیت (Popery) کو تفریح اور اچھی زندگی کا ذریعہ سمجھنے لگا تھا۔ میں اب آسانی سے اس کو برداشت کرنے کے لیے تیار تھا گو میں نے اسے وقتی طور پر بھی اپنا پیشہ بنانے کے بارے میں کبھی نہ سوچا تھا۔

تاحال تو ایسا خیال ہی مجھے خوفزدہ کر دیتا تھا۔ میں نے جو وعدہ کر لیا تھا اس پر اور اس کے اثرات پر مجھے خوف محسوس ہوتا تھا۔ میرے اردگرد وہ لوگ جو مستقبل میں ایک نیا مذہب قبول کرنے والے تھے وہ میرے لیے (بہادری کی) کوئی مثال نہ تھے۔ میں (خود بھی) جو نیک کام کرنے جا رہا تھا وہ مجھے کسی بدمعاش کا کام لگتا تھا۔ اگرچہ میں ابھی بچہ ہی تھا لیکن مجھے یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ اس مذہب کے سچا ہونے کے باوجود میں اسے بیچنے جا رہا تھا اور اگر ان (مذاہب) میں سے بہترین بھی اختیار کر لوں پھر بھی میں نے روح القدس (تثلیث میں تیسری ذات) سے جھوٹ بولا تھا اور میں ہر انسان کی حقارت کا حقدار بن گیا تھا۔

میں جتنا اس بارے میں سوچتا اتنا ہی خود کو ذلیل سمجھتا اور اس تقدیر پر کانپ جاتا جس نے مجھے اس ناخوشگوار صورتحال میں پھنسا دیا تھا کیونکہ میری موجودہ صورتحال میں میری مرضی شامل نہ تھی۔ کبھی کبھی تو میرا یہ دکھ اتنا بڑھ جاتا کہ دروازہ کھلا ہوتا اور ایک لمحے میں، میں وہاں سے فرار ہو جانے کی سوچتا لیکن یہ ناممکن تھا۔ میرا لمبے عرصے تک وہاں رہنے کا ارادہ بھی میرے بہت سے خفیہ مقاصد کی وجہ سے دیر تک قائم نہ رہ سکتا تھا۔

میرا جنیوا نہ جانے کا ارادہ، اس کی وجہ سے ہونے والی شرمندگی، پہاڑوں سے پھر سے گزرنے کی تکلیف، اپنے ملک اور دوستوں سے دوری، پیسوں کی قلت ___ ہر چیز مجھے میرے ضمیر کی خلش کے بارے میں سوچنے پر مجبور کرتی تھی۔ یہ خلش میری (دیر سے کی جانے والی) توبہ تھی۔ میں نے جو کیا تھا اس پر خود کو سرزنش کرتا تھا اور جو میں کرنا چاہتا تھا، اس کے بہانے ڈھونڈتا رہتا تھا۔ میں ماضی کی غلطیوں کی سنگینی بڑھا کر مستقبل کو ان کا ناگزیز انجام سمجھتا تھا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ابھی کچھ نہ ہوا تھا اور اگر تم اس بات سے خوش ہوتے ہو تو تم بے گناہ تھے لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ اپنے کیئے ہوئے کام پر پچھتاوٗ جس نے تمہیں اپنی ناانصافیوں کو چھپانے پر مجبور کر دیا ہے۔

میں نے انہیں جو اُمیدیں دلائی تھیں انہیں رَدّ کرنے کے لئے ان زنجیروں کو توڑنے کے لئے جنھوں نے مجھے غلام بنا دیا تھا اور مستقل مزاجی سے یہ کہنے کے لئے کہ میں اپنے آباوٗ اجداد

کے مذہب پر قائم رہنا چاہتا ہوں' خواہ اس کا جو بھی انجام ہو ــــ ان تمام کاموں کیلئے اس سے زیادہ ہمت چاہئے تھی جو اس عمر میں میرے اندر ہو سکتی تھی۔ معاملہ بہت آگے بڑھ چکا تھا اور میری بھرپور کوششوں کے بعد وہ اس کا کوئی نتیجہ نکالنے میں کامیاب ہو ہی گئے۔

وہ باطل دلیل جس نے مجھے برباد کر دیا تھا یہ تمام انسانیت پر بھی ایسا ہی اثر کرتی تھی جو اس وقت استدلال کی ضرورت کو محسوس کر کے افسوس کرتے ہیں جب اس پر عمل کرنے کا وقت گزر جاتا ہے۔ نیکی پر عمل صرف ہماری لاپروائی کی وجہ سے مشکل ہوتا ہے اگر ہم ہر وقت محتاط رہیں تو ہمیں بہت کم اس پر عمل کرنے میں تکلیف محسوس ہو۔ ہم جن خواہشات کو اہمیت دیتے ہیں جلد ہی ان کے ماتحت بن جاتے ہیں اور چیزیں قابل مزاحمت ہوتی ہیں ان کے سامنے ہم فوراً ہار مان جاتے ہیں اور خود کو بآسانی پریشان کن اور خطرناک صورتحال میں پھنسا لیتے ہیں' جن سے ہم بہت مشکل سے نکل پاتے ہیں۔ اس مشقت سے گھبرا کر ہم ایک کھائی میں جا گرتے ہیں۔ پھر ہم خدا سے یہ شکایت کرتے ہیں کہ اس نے ہمیں اتنا کمزور کیوں بنا دیا؟ لیکن وہ ہمارے ان بہانوں کو نہیں سنتا اور ہمارے ضمیر کے ذریعے ہمیں جواب دیتا ہے کہ میں نے تمہیں اس خلیج کو پار کرنے کے لئے اتنا کمزور اس لیے بنایا کہ میں نے تمہیں اس میں نہ گرنے کے لیے کافی ہمت عطا کی تھی۔

میں نے کیتھولک بننے کا ارادہ نہ کیا تھا مگر چونکہ مجھے اپنے ارادے کا فوری اظہار کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی لہٰذا میں نے آہستہ آہستہ خود کو اس خیال کی عادت ڈال لی۔ اس دوران مجھے یہ اُمید بھی تھی کہ کوئی غیر متوقع واقعہ مجھے اس الجھن سے آزاد کر دے گا۔ وقت حاصل کرنے کی خاطر میں نے اپنے فیصلے کا دفاع کرنے کے لیے تیاری کر لی تھی لیکن میری خودنمائی کی عادت نے جلد ہی اس فیصلے کو غیر ضروری قرار دے دیا کیونکہ میں نے دیکھا کہ میں اکثر اپنے اساتذہ (جو وہاں مجھے تعلیم و ہدایات دیتے تھے) کو شرمندہ کر دیتا تھا سو میں انہیں مکمل طور پر زیر و زبر کر کے اپنی کامیابی کا احساس دوبالا کرنا چاہتا تھا۔ میں جوش و خروش سے اپنے منصوبے پر عمل کرتا رہا' میں نے دل میں یہ اُمید بالکل نہ رکھی کہ میں خود میں تبدیلی لانے والوں میں کوئی تبدیلی لا سکوں گا۔ میں اتنا سادہ تھا کہ اس بات پر اُمید نہ رکھتا تھا کہ میں انہیں غلطیوں کا احساس دلا پاؤں گا یا یہ کہ وہ پروٹسٹنٹ بن جائیں گے۔ انہیں اپنے کام میں یہ رعایت حاصل نہ تھی کیونکہ انھوں نے میری جو تصویر بنا رکھی تھی میں خواہش اور عزم کے لحاظ سے اس سے بالکل مختلف تھا۔

پروٹسٹنٹ کو اپنے مذہب کے اصولوں کی تعلیم کیتھولک کی نسبت بہتر انداز سے دی جاتی ہے۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے ــــ اول پروٹسٹنٹ کی تعلیمات بحث طلب ہیں دوم ــــ (کیتھولک

ازم ) صرف اطاعت مانگتا ہے۔ ایک کیتھولک کو دوسروں کے فیصلے پر قناعت کرنا پڑتی ہے جبکہ ایک پروٹسٹنٹ کو اپنے فیصلے خود کرنا پڑتے ہیں۔ وہ یہ تمام باتیں جانتے تھے لیکن بحث کرنے والے ان لوگوں کے لئے میری عمر اور شکل وصورت پریشانی کا پتہ ___ نہ دیتی تھی۔ اسی طرح وہ یہ بھی جانتے تھے کہ مجھے میرے پہلے روحانی احساسات کے تبادلے کا موقع فراہم نہ کیا گیا تھا اور نہ ہی اس کے ساتھ ملنے والی تعلیمات دی گئی تھیں۔ لیکن دوسری طرف انہیں مسٹر لمبسائر سے مجھے ملنے والی معلومات کا علم نہ تھا اور نہ ہی یہ معلوم تھا کہ میں چرچ اور حکومت کے بارے میں اپنے والد کے گھر اچھی طرح پڑھ چکا تھا۔ اگرچہ اس وقت کے بعد سے میں اسے تقریباً بھول چکا تھا لیکن مناظرے کے دوران جوش میں (جوان شریف لوگوں کے لیے بڑی بدنصیبی کی بات تھی) مجھے پھر سے سب کچھ یاد آ گیا تھا۔

ایک چھوٹے سے قد کے بوڑھے پادری نے ___ جو خاصا قابل احترام دکھائی دیتا تھا، نے پہلی محفلِ مشاورت کی جس میں ہم سب کو طلب کیا گیا تھا۔ میرے ساتھیوں کے لیے یہ مناظرے سے زیادہ (تحریری) سوال جواب کا سلسلہ تھا۔ اس پادری کے لیے ہمیں تعلیم دینے سے زیادہ ان کے اعتراضات کے جواب دینا مشکل تھا۔ لیکن جب میری باری آئی تو معاملہ بالکل مختلف ہو گیا کہ میں اسے ہر بات پر روکتا تھا اور میں نے کسی ایسی بات کو جانے نہ دیا جو کسی مشکل کا باعث بن سکتی تھی۔ اس چیز نے اس محفل مشاورت کو میرے ساتھیوں کے لیے لمبا اور اکتا دینے والا بنا دیا تھا۔ میرا بوڑھا پادری بہت بولتا تھا اور تھا بھی بہت پُر جوش۔ وہ بار بار اپنے موضوع سے ہٹ جاتا۔ وہ خود کو یہ کہہ کر مشکل سے نکالتا کہ اسے فرانسیسی اتنی اچھی نہ آتی ہے۔

اگلے دن صرف اس وجہ سے کہ کہیں میرے خفیہ اعتراضات ان لوگوں کے ذہن بھی نہ خراب کر دیں جن کا (اس طرف) رجحان ہو چکا تھا' مجھے ایک نوجوان پادری کی نگرانی میں علیحدہ کمرے میں منتقل کر دیا گیا۔ وہ اچھا مقرر بھی تھا یعنی وہ لمبے اور بے معنی جملے بولنے کا شوقین تھا اور اگر کوئی معالج ایسا کرتا ہے تو وہ بھی اپنی صلاحیتوں پر نازاں تھا۔ لیکن میں نے خود کو اس کی دبنگ شخصیت سے دبنے نہ دیا۔ مجھے یہ معلوم تھا کہ میں اپنی بات پر قائم رہ سکتا ہوں سو میں اس کے دعوؤں کا مقابلہ اور اس کی غلطیوں کو بے نقاب کرتا رہا۔ میں تہذیبی طریقے سے اپنی جگہ قائم رہا۔ ایک بار اس نے مجھے سینٹ آگسٹن، سینٹ گریگوری اور بقیہ تمام پادریوں کے بارے میں چپ کرانے کی کوشش کی لیکن پھر اس کو یہ جان کرنا قابل بیان حیرت ہوئی کہ میں بھی ان (موضوعات) پر اتنی ہی مہارت رکھتا ہوں جتنی وہ رکھتا تھا حالانکہ میں نے انہیں نہ پڑھا تھا اور

شاید اس نے بھی نہیں!! لیکن میں نے اپنی لی سائر (کتاب کا نام) کے کچھ پیرے ذہن نشین کر رکھے تھے۔ جب وہ کوئی حوالہ دے کر مجھ پر بازی لے جانے کی کوشش کرتا تو میں اسے کوئی دوسرا حوالہ دے کر روکتا اور یہ طریقہ اس کے لئے کافی شرمندگی کا باعث بنتا۔ بالآخر وہ مجھ پر بازی لے جانے میں کامیاب ہو گیا اور اس کی دو زبردست وجوہات تھیں ایک تو یہ کہ وہ مضبوط فریق ___ تھا اور میں اپنی عمر کی وجہ سے اسے آخری حد تک نہ لے جانا چاہتا تھا۔ کیونکہ میں صاف طور پر دیکھ رہا تھا کہ بوڑھا پادری مجھ سے اور میری قابلیت سے مطمئن نہ تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ پڑھا لکھا ہونے کی وجہ سے دلیل دینے کا طریقہ جانتا تھا' جس سے میں نا آشنا تھا اور شاید اسے اپنا نہ سکتا تھا۔ جب بھی وہ کسی غیر متوقع اعتراض میں الجھ جاتا تو وہ اسے اگلے مناظرے پر اُٹھا رکھتا اور یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتا کہ میں موضوع سے بھٹک گیا تھا۔ کبھی کبھار وہ میرے تمام حوالے یہ کہہ کر مسترد کر دیتا کہ وہ غلط ہیں۔ اگر میں کتاب لا کر ثبوت پیش کرنے کا کہتا تو وہ مجھے اکساتا۔ اسے معلوم تھا، اس میں اس کا کوئی نقصان نہ ہوگا کہ میں نے اپنی تعلیم اِدھر اُدھر سے ادھار لے رکھی تھی اور کتابوں سے اتنا مانوس نہ تھا۔ میں لاطینی زبان کا اتنا بڑا محقق نہ تھا کہ اگر مجھے کبھی یقین نہ بھی ہوتا کہ میرے مطلب کی چیز کہاں موجود ہے پھر بھی ایک ضخیم کتاب سے وہ پیرا ڈھونڈنا میرے لیے مشکل ہوتا۔ مجھے اس پر یہ شک بھی تھا کہ وہ ہمارے پادریوں پر جس غداری کا الزام لگاتا وہ خود ہی اس کا ارتکاب کر رہا ہوتا اور جو اعتراضات اس کو مشکل میں ڈال دیتے تھے۔ ان کے جواب وہ خود سے گھڑ لیتا تھا۔ اس دوران ہسپتال دن بدن میرے لیے نا قابل برداشت جا رہا تھا کیونکہ وہاں سے نکلنے کا یہ واحد طریقہ تھا سو میں نے یہ کوشش کی کہ میں اپنے (پرانے مذہب سے) دستبرداری کے عمل میں اسی جذبے سے تیزی لاؤں جتنا میں نے اسے آہستہ کرنے کے لیے اپنایا تھا۔

ان دو افریقیوں کے عیسائیت قبول کرنے پر بڑا جشن منایا گیا۔ ان کے پھر سے جنم لینے والی روحوں کی پاکی کو ظاہر کرنے کے لیے اُن کو سر سے پیر تک سفید کپڑوں میں ملبوس کیا گیا۔ میری باری ایک مہینے بعد آئی کیونکہ میرے منتظم اتنے عرصے کو ضروری سمجھتے تھے تا کہ انہیں مشکل بحث کا موقع مل سکے اور وہ اپنے عقائد اور اصول بار بار دہراتے تا کہ وہ میری مکمل اصلاح کر کے اپنی کامیابی میں اضافہ کر سکیں۔

غرضیکہ جب مجھے اچھی طرح تعلیم دے دی گئی اور میں اپنے اساتذہ کی مرضی کے سانچے میں ڈھال دیا گیا' تو مجھے سینٹ جان کے چرچ میں اپنی مذہبی دست برداری کے لیے اور ایسے موقعوں پر کی جانے والی مذہبی رسومات کے لیے لے جایا گیا۔ یہ اگر چہ بپتسمہ نہیں ہوتا لیکن اسی

سے ملتا جلتا ہے اور لوگوں کو اس سے یہ بتانا مقصود ہوتا ہے کہ پروٹسٹنٹ عیسائی نہیں ہوتے۔ مجھے ایک سلیٹی رنگ کے چوغے میں ملبوس کیا گیا۔ وہ سفید Brandenburgs سے سجایا گیا تھا جسے وہ ایک چابی کی مدد سے کھڑکھڑاتے جائے۔ اس میں وہ نیک لوگ خیرات ڈالتے جاتے تھے جو یا تو مذہب سے متاثر ہوتے تھے یا پھر ایک نو مذہب کے لیے نیک تمنائیں رکھتے تھے۔ غرضیکہ کیتھولک ازم ایسا کوئی تماشہ نہ چھوڑا گیا جس سے لوگ روحانی طور پر استفادہ حاصل کر سکتے یا جس سے مجھے شرمندگی نہ ہوتی۔ سفید لباس اگرچہ کارآمد ثابت ہوا تھا مگر میں نہ تو حبشی تھا اور نہ ہی یہودی اس لیے انھوں نے میری تعریف کرنا مناسب نہ سمجھا۔

یہ معاملہ یہیں ختم نہ ہوا۔ اب مجھے احتساب کے لیے جانا تھا تاکہ میں کفر کر کے جو خوفناک گناہ کا مرتکب ہوا تھا اس کے لیے مجھے بے گناہ قرار دیا جائے۔ اور میں انھی رسم و رواج کے ساتھ چرچ واپس لوٹ سکوں جو ہنری چہارم کے لیے اس کے سفیر نے ادا کیے تھے۔ احتساب کرنے والے پادری کا طرزِ عمل کسی طرح بھی میرا وہ خوف کم کرنے میں مددگار ثابت نہ ہوا جو اس مقدس جگہ داخل ہو کر مجھے محسوس ہوا تھا۔ میرے عقائد، حالات اور خاندان کے بارے میں کئی سوالات کرنے کے بعد اس نے مجھ سے یہ صاف صاف پوچھ لیا کہ کیا میری ماں ملعون تھی؟ پہلے تو میرا غصہ خوف کی وجہ سے دبا رہا پھر اس نے مجھے سنبھلنے کا موقع دیا۔ میں نے جواب دیا کہ مجھے اُمید ہے کہ ایسا نہ تھا کیونکہ خدا نے اسے اس کے آخری لمحات میں ہدایت دے دی ہو۔ اس نے کوئی جواب تو نہ دیا لیکن اس کی خاموشی اور نظر میں پسندیدگی کے کوئی آثار نہ تھے۔

بالآخر یہ رسومات ختم ہوئیں اور جس لمحے مجھے یہ اُمید بندھی کہ اب وہ مجھے کافی زادِ راہ مہیا کریں گے۔ اسی لمحے انھوں نے مجھے ایک اچھا عیسائی بن کر رہنے کی اور اس نعمت پر شکر ادا کرنے کی نصیحت کی۔ انھوں نے مجھے میرے اچھے مستقبل کے لیے دعا دی۔ میری جیب میں بیس فرانک سے کچھ زیادہ ہی تھے اور وہ بھی اوپر بیان کی گئی جمع پونجی کا نتیجہ تھے۔ اور پھر مجھے وہاں سے نکال کر دروازہ بند کر دیا گیا۔ اس کے بعد میں نے انہیں کبھی نہ دیکھا۔

اس طرح ایک ہی لمحے میں میری تمام خوش فہمیاں ختم کر دی گئیں۔ میری اس دلچسپ تبدیلی (مذہب) کی صرف اتنی یاد باقی رہ گئی کہ مجھے دھوکہ دیا گیا تھا اور مرتد بنا دیا گیا تھا۔ آپ اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ اس واقعے نے میرے خیالات پر کیا اثر ڈالا ہوگا کہ جب مجھے اس طرح تباہی میں دھکیل کر، میری پیسے کمانے کی تمام اُمیدوں کو خاک میں ملا دیا گیا تھا۔ ابھی دن کے وقت میں یہ سوچ رہا تھا کہ کس محل میں جا کر رہنا چاہیے اور رات سے پہلے میں سڑک پر آ گیا تھا۔ شاید آپ یہ

سوچیں کہ میں اب بالکل مایوس ہو گیا تھا اور اس خیال نے مجھے مزید تلخ بنا دیا ہو گا کہ میری غلطی میرے یہاں تک پہنچنے کا سبب بنی مگر حقیقت یہ ہے کہ میں نے ایسا کچھ محسوس نہیں کیا۔ میں نے دو مہینے گوشہ نشینی میں گزارے تھے۔ یہ سب میرے لیے بنا تھا میں اب آزاد تھا۔ میرے اندر جو احساس سب سے زیادہ مضبوط ___ تھا وہ اپنی آزادی کی خوشی کا تھا۔ ایک اکتا دینے والی غلامی کے بعد میں پھر سے اپنے وقت اور اعمال کا مالک تھا۔ میں ایک بڑے شہر میں تھا جہاں وسائل کی کمی نہ تھی اور جہاں کئی دولت مند لوگ رہتے تھے جن کے لیے میرے جوہر اور قابلیت قابل قدر تھے۔ میرے پاس اس دولت کی آرزو کرنے کے لیے بہت وقت تھا کیونکہ میرے بیس لیورز مجھے نہ ختم ہونے والا خزانہ لگتا تھا جسے میں بغیر کسی کو حساب کتاب دیئے خرچ کر سکتا تھا۔ میرے لیے یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے خود کو اتنا امیر محسوس کیا اور میں نے ذہن میں کسی افسردہ خیال کو جگہ دینے کے بجائے پُر اُمید کیا جس میں خود سے محبت بھی شامل تھی۔ میں نے پہلے کبھی اتنا اعتماد اور تحفظ نہ محسوس کیا تھا۔ میں خود کو ابھی سے خوش حال محسوس کر رہا تھا اور اس کا سہرا صرف میرے اپنے سر تھا۔

میں نے جو کام سب سے پہلے کیا وہ سارے شہر کی آوارہ گردی کر کے اپنے تجسس کو کم کرنا تھا۔ ایسا میں نے خود کو اپنی آزادی کا یقین دلانے کے لیے کیا۔ میں نے فوجیوں کو ان کی چوکی پر دیکھا اور ان کا فوجی ساز و سامان دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ میں (پادریوں کے) جلوس کا پیچھا کرتا اور ان کی موسیقی سنکر خوش ہوتا۔ اس کے بعد میں ڈرتے ڈرتے بادشاہ کے محل گیا لیکن دوسروں کو اندر داخل ہوتا دیکھ کر میں نے بھی ان کی تقلید کی اور کسی نے مجھے نہ روکا۔ شاید یہ اس جھوٹے بنڈل کی وجہ سے تھا جو میں نے اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا۔ جو بھی تھا، ان حالات میں، میں نے اپنے انجام کے بارے میں بڑی بڑی آراء قائم کرلیں اور خود کو ابھی سے وہاں کا باسی سمجھنے لگا تھا۔ موسم گرما تھا، میں چلتا رہا، یہاں تک کہ میں تھکن اور بھوک سے نڈھال ہو گیا۔ کھانے پینے کی کسی ہلکی سی چیز کی خواہش میں، میں ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں دودھ ملتا تھا۔ وہاں سے میں نے روغنی پنیر، دہی، عرق شیر (Whey) اور ساتھ میں پائیڈ مونٹ بریڈ سے دو توس لیے جو مجھے بہت زیادہ پسند تھے۔ پانچ یا چھ ساس میں، میں نے اپنی زندگی کا سب سے اچھا کھانا کھایا۔

اب وقت آ گیا تھا کہ میں اپنی رہائش کا بندوبست کروں۔ مجھے اتنی پائیڈ مونٹیز زبان آتی تھی کہ میں آسانی سے اپنی بات سمجھا سکتا تھا۔ اس طرح یہ کام میرے لئے اتنا مشکل نہ تھا۔ میں اتنا محتاط تھا کہ میں اسے اپنے ارادے میں تبدیلی کے بجائے اپنی جیب کی حالت کے مطابق چاہتا تھا۔

اس تلاش کے دوران مجھے پتہ چلا کہ ایک فوجی کی بیوی جو کہ Po-Street میں رہتی تھی وہ ملازموں کو رہائش کی سہولت فراہم کرتی ہے۔ وہ ایک رات کا ( کرایہ ) ایک ساس لیتی تھی۔ مجھے وہاں ایک بستر خالی مل گیا سو میں نے اس پر قبضہ کر لیا۔ وہ کم عمر اور نو بیاہتا تھی اگر چہ اس کے پہلے ہی پانچ یا چھ بچے تھے۔ ماں، بچے اور کرائے دار سب ایک کمرے میں سوتے تھے اور جب تک میں وہاں رہا ایسے ہی چلتا رہا۔ وہ اچھی طبیعت کی مالک تھی اور کسی Carman کی طرح قسمیں کھاتی تھی۔ وہ نہ ہی ٹوپی پہنتی تھی اور نہ رومال لیتی تھی لیکن وہ شریف خاتون تھی، ہر بات میں دخل اندازی کرتی اور میرے لئے وہ رحم دل اور مدد کرنے والی تھی۔

کافی دنوں تک میں اپنی آزادی اور تجسس میں رہا، شہر اور اس کے مضافات میں آوارہ گردی کرتا رہا۔ میں ہر اس چیز کو غور سے دیکھتا جو یا تو نئی ہوتی یا پھر جو میرے تجسس کو بڑھاتی اور ایک نو آموز کو اکثر چیزیں ایسی ہی لگتی ہیں۔ میں نے دربار میں جانا نہ چھوڑا اور ہر صبح بادشاہ کے ( محل میں ہونے والی ) دعا میں شامل ہوتا۔ مجھے خود کو شہزادے اور اس کے نوکر چاکروں کے ساتھ ایک ہی گرجے میں موجود ہونا قابل فخر محسوس ہوتا تھا' مگر میرے لئے دربار کی چمک دمک سے زیادہ اہم میرا موسیقی سے لگاؤ تھا جس نے اب اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا تھا۔ جلد ہی میں نے محسوس کر لیا کہ دربار میں کچھ بھی نہیں ہوتا۔ سو اس کی طرف میری توجہ اب کم ہوتی جا رہی تھی۔ اُس وقت سارڈینیا کے پاس یورپ کی سب سے اچھی موسیقی تھی۔ وہاں Somis, Desjardins اور Bezuzzi باری باری آ کر اپنا رنگ دکھاتے رہے۔ یہ سب ایک ایسے نوجوان کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے ضروری نہ تھا، جو صرف ایک سادہ سا آلۂ موسیقی سن کر خوش ہو جایا کرتا تھا۔ شان وشوکت سے بس ایک ( بے وقوفانہ سی ) پسندیدگی میں اضافہ ہوا لیکن میرے دل میں اس سے ___ فائدہ اُٹھانے کی کوئی شدید خواہش شامل نہ تھی۔ میرا دھیان اصل میں کسی ایسی شہزادی کی تلاش میں تھا جو میرے اظہار عقیدت سے متاثر ہو اور جسے میں اپنی محبت کی داستان کی ہیروئن بنا سکوں۔

اس وقت میں بالکل آغاز پر تھا اور میرا تعارفی دائرہ بہت محدود تھا۔ یہ سچ تھا لیکن اگر میں اس کا نتیجہ نکال سکتا تو مجھے اس سے زیادہ خوشی کہاں ملنی تھی۔ اگر چہ میں خرچہ کرنے میں بہت محتاط تھا لیکن میری جیب نہ جانے کیوں ہلکی ہوتی جا رہی تھی۔ میرا یہ کم خرچ کرنا احتیاط کی وجہ سے کم جبکہ میری سادگی سے محبت کی بدولت زیادہ تھا۔ اور آج بھی مہنگی سے مہنگی ضیافت اس کو متاثر نہیں کر سکی۔ اس زمانے میں اور آج بھی میرے خیال میں ایک کسان کے ناشتے سے زیادہ لذیذ کچھ نہیں ہو سکتا۔ آپ مجھے دودھ، سبزی، انڈے، براؤن بریڈ اور کچھ گزارے لائق شراب دے دیں' میں

سمجھوں گا کہ آپ نے مجھے پُر تکلف کھانا کھلا دیا۔ ہوٹل کے منیجر اور غیر ضروری بیرے میرا پیٹ نہیں بھر سکتے لیکن اگر مجھے خوب بھوک لگی ہے، تو میں سمجھوں گا کہ بقیہ چیزوں کی کمی پوری ہو گئی................اس وقت سے آج تک چھ یا سات Sous میں، میں ایک اچھا کھانا کھا سکتا ہوں جو کہ اتنی تعداد میں فرانک خرچ کرنے سے بھی نہیں ملتا۔ سو میں ___ کھانے پینے میں محتاط تھا، ورنہ شاید میں اس طرف راغب ہو جاتا۔ مجھے معلوم نہیں لیکن میں اس کو نفس کشی کہہ کر غلطی کروں گا کیونکہ اپنی ناشپاتیوں، سنئے پنیر، ڈبل روٹی اور Montferrat کی شراب کے ساتھ میں شاید بہت خوش خوراک تھا! باوجود اس کے کہ میرا خرچ بہت کم تھا، لیکن بیس فرانک کا خاتمہ تو ہونا تھا۔ مجھے اِس کا مکمل یقین تھا اور نوجوانی کی بے فکری کے باوجود مستقبل کے بارے میں میرا خوف دہشت کے قریب پہنچ چکا تھا۔ میرے تمام ہوائی قلعے مسمار ہو چکے تھے اور میں نے ایک ایسے روزگار کی تلاش کو ضروری محسوس کیا جو میری معاشی ضروریات کو پورا کر سکے۔

یہ بھی ایک مشکل کام تھا مجھے اپنی نقش نگاری کے بارے میں خیال آیا۔ لیکن میں ابھی اتنا ہنر مند نہ تھا کہ ایک ایسے شہر میں کہ جہاں میں مسافر تھا، وہاں اس کو اپنے پیشے کے طور پر اپنا سکتا۔ پھر ٹیورن میں اتنے استاد بھی نہ تھے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ جب تک کوئی بہتر صورت نظر نہیں آتی تو میں دوکانوں پر جا کر چھوٹی موٹی چیزوں، فوجی مارکوں (Coats of Arms) یا دھات کے ٹکڑوں پر نقش نگاری کروں۔ مجھے اُمید تھی کہ میں کم پیسوں میں کوئی ملازمت ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جاؤں گا یا جو کچھ بھی وہ دیں گے قبول کر لوں گا لیکن اس معاملے میں بھی میری اُمیدیں پوری نہ ہو سکیں۔ میری تمام درخواستیں رد کر دی گئیں۔ جو تھوڑا بہت میں کما لیتا تھا وہ میرے کھانے کے لئے بھی ناکافی تھا۔

ایک دن میں صبح صبح Contranova میں چہل قدمی کر رہا تھا کہ میں نے کاؤنٹر کے پیچھے ایک پُرکشش خاتون کو دیکھا۔ خواتین سے کترانے کے باوجود میں دکان میں بغیر کسی جھجک کے داخل ہو گیا۔ میں نے اپنی عادت کے مطابق اس کی مدد کرنے کی کوشش کی اور یہ جان کر بہت خوش ہوا کہ اس نے میری کو قبول کر لیا۔ اس نے مجھے بٹھایا اور میرے بارے میں پوچھا، میری مایوس صورت حال پر افسوس ظاہر کیا اور مجھے خوش رہنے کے لیے کہا۔ اس نے مجھے خوش کرنے کے لیے کہا کہ ہر اچھا عیسائی میری مدد کرے گا۔ پھر اس نے کسی کو سُنار سے وہ اوزار لانے کو کہا جن کی مجھے ضرورت تھی اور پھر خود اوپر چلی گئی اور میرے ناشتے کے لیے کچھ لیکر آئی۔ اس سے میری کچھ اُمید بندھی اور اس کے بعد پیش آنے والے واقعات بھی کافی پُر اُمید تھے۔ وہ میرے کام سے مطمئن تھی

اور جب میں کچھ سنبھلا تو وہ میری بات چیت سے بھی متاثر ہوئی۔ اس نے کافی نفیس کپڑے پہن رکھے تھے۔ اور اس کے باوقار حلیئے کے باوجود اس کی یہ بے فکری مجھے پریشان کر رہی تھی لیکن اس کی اچھی فطرت، اس کی غمخوار آواز، اس کے نرم اور پیار بھرے طریقے نے جلد ہی میری پریشانی دور کر دی۔ میں نے دیکھا کہ میری اُسے خوش کرنے کی تمام کوششیں کامیاب ہوئی تھیں۔ اس نے مجھے (اسے خوش کرنے کے لیے) مزید محنت کرنے کی ہمت دی۔ اگر چہ وہ اٹلی کی رہنے والی تھی اور اتنی خوبصورت تھی کہ ناز نخروں سے بچ نہ سکتی تھی۔ پھر بھی اس کے اندر حیاء بہت حد تک موجود تھی۔ دوسری طرف میں بہت بزدل تھا۔ اس لیے ہماری اس ملاقات کا اتنی جلدی کوئی نتیجہ نہ نکل سکتا تھا اور نہ ہی انھوں نے ہمیں اس کا موقع دیا۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے اس پیاری خاتون کے ساتھ جو کچھ تھوڑا بہت وقت گزارا اس میں مجھے کسی بھی لمحے اس کی خوبصورتی کا احساس نہ ہوا ہو۔
یہ حالت میرے لیے بیک وقت تکلیف اور خوشی کا باعث ہوتی کیونکہ میں اتنا سادہ تھا کہ مجھے اپنی بے چینی کی وجہ بھی معلوم نہ تھی۔ مجھے یہ فرض کرنا چاہئے کہ اسے تنہائی ویسے بھی پسند نہ تھی کہ وہ اکثر اس کے لیے بہانے ڈھونڈتی رہتی تھی۔ اسے وہ جس طرح استعمال کرتی تھی یا مجھے استعمال کرنے پر مجبور کرتی تھی اس کی وجہ سے یہ نہایت بے کار کوشش تھی۔

ایک دن کلرک کی باتیں سن سن کر وہ تھک گئی تو اپنے کمرے میں چلی گئی۔ میں نے جلدی جلدی دکان کے پچھلے حصے میں اپنا کام ختم کیا اور اس کے پیچھے پیچھے اس کے کمرے میں چلا گیا۔ کمرے کا دروازہ آدھا کھلا تھا اور میں سوچے بغیر اندر داخل ہو گیا۔ وہ کمرے کی دوسری طرف کھڑکی کے پاس بیٹھی کڑھائی کر رہی تھی۔ اس نے مجھے نہ دیکھا، ویسے بھی باہر گلی میں چھکڑوں ____ کا اتنا شور تھا کہ وہ میری آہٹ نہ محسوس کر سکی۔ وہ ہمیشہ مناسب کپڑے پہنے رکھتی تھی لیکن اس دن اس کا حلیہ ناز نخرے والا تھا' اس کا رویہ بہت اچھا تھا۔ اس کے آگے کی طرف جھکے ہوئے سر نے اس کی گردن کو واضح کر دیا تھا ____ اس کے نفاست سے بنے بال پھولوں سے سجے ہوئے تھے۔ اس کا حسن لاثانی تھا ____ اور مجھے بغیر کسی روک ٹوک کے اسے دیکھنے کا موقع ملا۔ میں بالکل بے خودی کے عالم میں تھا اور نہ چاہتے ہوئے بھی میں اپنے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور میں نے اپنی بانہیں اس کی طرف پھیلا دیں۔ مجھے یقین تھا کہ اس نے مجھے نہیں سنا اور مجھے اس بات کا بالکل اندازہ نہیں تھا کہ وہ مجھے دیکھ سکتی ہے، لیکن کمرے میں ایک شیشہ تھا جس میں میری تمام حرکات صاف نظر آ رہی تھیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس کا اُس پر کیا اثر ہوا ہوگا۔ اس نے کچھ کہا نہ میری طرف دیکھا البتہ اس نے اپنا سر تھوڑا سا موڑا اور صرف اپنی انگلی سے اپنے پیروں میں پڑے

قالین کی طرف اشارہ کیا۔ میں ایک ہی لمحے میں خوشی سے چیختا ہوا وہاں پہنچ سکتا تھا، جہاں اس نے اشارہ کیا تھا لیکن آپ شاید ہی یقین کریں کہ میں نے مزید کچھ کرنے کی کوشش کی نہ ہی نظر اُٹھا کر اس کی طرف دیکھا، میں ایک لمحے کے اندر اس کی گود میں بیٹھنے کی کوشش کی۔ میرا رویّہ ایسا تھا کہ مجھے اس سہارے کی سخت ضرورت تھی۔ میں گم سم اور بے حرکت تھا لیکن میرے اندر سکون نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ میرے اندر پریشانی، خوشی، شکرگزاری اور کچھ پُرجوش اور نامعلوم سی خواہشات مچل رہی تھیں۔ لیکن یہ اسے ناخوش کرنے کے خوف سے دبی ہوئی تھیں جس کا میرے تجربہ کار دل کو کافی اندیشہ تھا۔ میں ان تمام جذبات میں امتیاز کر سکتا تھا۔ وہ مجھ سے زیادہ پرسکون تھی اور نہ مجھ سے کم خوفزدہ...... وہ میری موجودہ مضطرب صورت حال پر بے چین تھی کہ خدا نہ کرے وہ اس کی ذمہ دار تھی۔ وہ اپنی ان غلطیوں کی علامات دیکھ کر کانپنے لگی کہ اس نے ان کے نتائج پر غور نہ کیا تھا۔ اُس نے میری حوصلہ افزائی کی اور نہ ہی اپنی ناراضگی کا اظہار کیا اور اپنے کام پر نظر جما کر ہر چیز سے بیگانگی کا اظہار کرنے کی کوشش کی۔ لیکن میری بیوقوفی نے مجھے یہ نتیجہ نکالنے سے نہ روکا کہ وہ میری شرمندگی اور شاید بے خودی میں بھی شامل تھی اور میری طرح وہ بھی ایک شرم کی وجہ سے رکی ہوئی تھی۔ اس مفروضے کے بغیر بھی وہ مجھے آگے بڑھنے کی ہمت دلا رہی تھی۔ میرے خیال میں وہ چونکہ مجھ سے عمر میں پانچ یا چھ سال بڑی تھی اس لیے اُسے ہر بات میں پہل کرنی چاہیے تھی اور چونکہ اس نے میری حوصلہ افزائی نہ کی تھی سو میں نے یہی سوچا کہ وہ اس بات سے ناراض ہوگئی ہے اور اس نے یہ سوچ کر کافی عقل کا مظاہرہ کیا تھا کہ مجھ جیسے ایک اناڑی کے لیے یہ نہ صرف حوصلہ افزائی بلکہ اصلاح کا بھی موقع تھا۔

مجھے نہیں معلوم کہ یہ وہ پُرجوش مگر گم سم کرنے والا منظر کس طرح ختم ہوا اور اگر مداخلت نہ ہوتی تو نجانے اور کتنی دیر میں اسی طرح بے حس و حرکت اس نامعقول لیکن لطیف حالت میں رہتا۔

اپنی پریشانی کے دوران مجھے میڈم باسل کے کمرے سے ملحقہ باورچی خانے کا دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ وہ پریشان ہوگئی اور تیز آواز میں مجھے کہنے لگی ''اُٹھو، روزینہ ادھر ہی آ رہی ہے'' میں جلدی سے اُٹھا اور میں نے اس کا آگے بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔ میں نے اس پر دو بوسے دیے۔ دوسری بار جب میں نے ایسا کیا تو مجھے محسوس ہوا کہ وہ خوبصورت ہاتھ میرے لبوں کو نرمی سے دبا رہا ہے۔ میری زندگی میں پہلے کبھی اس قدر پیارا لمحہ نہ آیا تھا۔ لیکن یہ موقع مجھے دوبارہ کبھی نہ ملا کہ ہماری محبت کا یہیں اختتام ہوگیا۔ ہوسکتا ہے کہ اس وجہ سے اس کی یاد آج بھی میرے دل پر اس خوبصورتی سے موجود ہے اور جب سے میں دنیا اور عورتوں سے آشنا ہوا ہوں اس میں مزید

چمک دمک آ گئی ہے۔ اگر وہ ذرا کم تجربہ کار خاتون ہوتی تو وہ اتنے کم سن عاشق کو جوش دلانے کے لیے کئی دوسرے طریقے استعمال کرتی۔ اس کا دل کمزور لیکن نیک تھا اور وہ ایک طاقتور مگر غیر اختیاری خواہش کو برداشت کرنے میں تکلیف محسوس کر رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ پہلی بار اس نے بے وفائی کی تھی۔ میرے لیے شاید اپنے سے زیادہ اس کے تامل کو فتح کرنا زیادہ مشکل تھا۔ میں نے اس کے ساتھ سب سے زیادہ ناقابل بیان خوشیاں محسوس کی تھیں۔ میں نے اس کے لباس تک کو ہاتھ لگانے کی جرأت کیے بغیر جو خوشی کے دو پل اس کے ساتھ گزارے تھے، ویسی خوشی میں نے کسی عورت کے ساتھ محسوس نہیں کی۔ مجھے یقین ہے کہ ہمیں ایک ایسی نیک عورت سے اطمینان ___ نصیب ہوتا ہے جس کے لیے ہم دل میں اچھی رائے رکھتے ہیں۔ اس کا کسی کے ساتھ مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ سب بے خودی ہے۔ انگلی کا ایک اشارہ، ہاتھ کا میرے ہونٹوں کو دبانا۔۔۔۔ میڈم باسل نے مجھ پر صرف یہی مہربانیاں کی تھیں۔ لیکن ان معمولی سی کرم فرمائیوں کی یاد ہی مجھے بے خود کر دیتی ہے۔

اس سے اگلے دو دن تنہائی میں ایسی ہی کسی ملاقات کا موقع ڈھونڈتا رہا مگر کوئی بات نہ بنی۔ ایسا کوئی موقع ڈھونڈنا تقریباً ناممکن تھا اور میرا خیال ہے کہ وہ خود بھی ایسا نہ چاہتی تھی۔ اس کا رویہ پہلے سے زیادہ سرد تو نہیں تھا لیکن ایک سرد مہری سی ضرور تھی۔ میرا خیال ہے کہ وہ اپنی نظروں پر قابو نہ رکھ سکتی تھی اسی لیے وہ میری نظروں سے بچتی پھرتی تھی۔ وہ منحوس کلرک میرے لیے پہلے سے بھی زیادہ ناقابل برداشت ہو گیا تھا۔ وہ مجھے تنگ کرنے لگا تھا اور اپنی حقارت کا اظہار اس طرح طنز کر کے کرتا کہ مجھے یقینی طور پر خواتین سے بات کرنے کا طریقہ سیکھنا چاہئے۔ میں یہ سوچ کر کانپ جاتا کہ شاید میں نے کوئی بے احتیاطی کی تھی۔ میں خود کو ایسے دیکھتا کہ جیسے میں کسی سازش میں ملوث ہوں اور اس کو چھپانے کے لیے میں ایسا پُر اسرار رویہ اختیار کرتا جس کی مجھے قطعاً ضرورت نہ تھی۔ یہ بات مجھے (اس سے تنہائی میں ملنے کے) مواقع تلاش کرنے میں مزید احتیاط برتنے پر مجبور کرتی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ میں ایسا موقع ڈھونڈوں گا جس میں حیرت یا گھبراہٹ کا کوئی عنصر شامل نہ ہو۔ میرے اس فیصلے کی وجہ سے مجھے کوئی موقع نہ ملا۔

محبت میں جو میری دوسری غلطی، جس پر میں کبھی قابو نہ پا سکا اور جو میری فطری بزدلی کے ساتھ مل جاتی تھی، جس کا نتیجہ اس کلرک کی پیش گوئی کے بالکل اُلٹ نکلتا تھا ___ وہ یہ تھی کہ میں اتنے خلوص بلکہ یہ کہوں گا کہ اتنی مکمل محبت کرتا تھا کہ بآسانی خوشی حاصل کر سکتا تھا۔ کبھی کسی کے جذبات میرے سے زیادہ پُر خلوص اور شدید نہ ہوئے ہوں گے نہ ہی کسی کے پیار میں اتنی نرمی،

سچائی یا بے غرضی ہو گی۔ میں جس سے محبت کرتا تھا اس کے لیے اپنی تمام خوشیاں قربان کر سکتا تھا۔ اس کی عزت میری زندگی سے زیادہ قیمتی تھی۔ میں اپنے لیے اس کے ذہنی سکون کی قیمت پر کوئی خوشی نہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس روّیے نے مجھے ہمیشہ زیادہ احتیاط اور خیال کرنے پر مجبور کیا اس کی وجہ سے میں اپنے معاملات میں اس قدر رازداری برتتا رہا کہ وہ سب ناکام ہی ہو گئے۔ غرضیکہ میری خواتین کے ساتھ کامیابی کی خواہش ہمیشہ پیار کرنے سے زیادہ رہی ہے۔

اب اگر ہم اپنے Egistus (بانسری بجانے والے) کی طرف لوٹیں تو یہ بات حیران کن تھی کہ بجائے اس کے کہ وہ مزید ناقابل برداشت ہو جاتا، اس غدار نے اخلاق کا برتاؤ اپنا لیا تھا۔ پہلے دن سے جب میڈم باسل نے مجھے اپنی نگرانی میں لیا تھا تو اس نے کوشش کی کہ میں گودام کے کاموں میں مدد کروں۔ جب اسے یہ پتہ چلا کہ میں قابل گزارہ حد تک حساب سمجھ لیتا ہوں تو اس نے اُس (اپنے کلرک) سے مجھے حساب کتاب نہ سمجھنے کو کہا۔ اُس بذلہ سنج ___ نے اس تجویز پر کوئی توجہ نہ دی اُسے شاید یہ ڈر تھا کہ میں اس کی جگہ لے لوں گا۔ چونکہ اس (تجویز) پر عمل نہ ہو سکا اس لیے میرا وہاں کل کام تھوڑی بہت نقش نگاری کے علاوہ کچھ بل اور کھاتے نقل کرنا اور Fair پر کتابیں لکھنا اور کچھ تجارتی خطوط اطالوی اور فرانسیسی میں ترجمہ کرنا تھے۔ اب ایکدم سے اس نے پہلے رد کی ہوئی اس کی تجویز پر عمل کرنے کی ٹھان لی اور کہا کہ وہ مجھے کھاتوں میں دہرا اندراج کر کے کام کرنا سکھائے گا اور مجھے اس قابل کر دے گا کہ میں میڈم باسل کے ساتھ کام کر سکوں گا۔ لیکن اس کے طور طریقے میں کوئی چیز اتنی جھوٹی، کینہ اور طنز سے بھرپور تھی کہ مجھے کسی طرح اس پر اعتبار نہ آتا تھا۔ میڈم باسل نے فوراً مکاری سے کہا کہ مجھے اس کی اتنی پیش کش پر اس کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ لیکن اسے اُمید تھی کہ یہ میری قابلیت کے عین مطابق ہو گا۔ اتنی سوجھ بوجھ کے بعد یہ صرف میری بدقسمتی ہو گی کہ میں ایک ادنیٰ سا کلرک رہوں۔

وہ اکثر یہ کہتی کہ مجھے کچھ ایسے لوگوں سے متعارف کروائے گی جو میرے کام آ سکیں گے۔ وہ یقینی طور پر مجھ سے دور ہونے کی ضرورت محسوس کر رہی تھی اور اس کا فیصلہ کر چکی تھی۔ ہمارا یہ خاموش معاہدہ جمعرات کے دن ہوا تھا اور اس سے اگلے اتوار اس نے ایک دعوت کی۔ مہمانوں میں ایک خوش شکل راہب بھی شامل تھا جس سے اس نے مجھے متعارف کروایا۔ وہ میرے ساتھ شفقت سے پیش آیا اور میری تبدیلی مذہب پر مجھے مبارک دی۔ وہ میری کہانی کے کئی حوالے دے رہا تھا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ اسے اس بارے میں بتایا گیا تھا۔ پھر میرے کندھے پر تھپتھپاتے ہوئے اس نے مجھے اچھائی کی نصیحت کی اور اپنا حوصلہ بلند رکھنے کو کہا۔ اس نے مجھے چرچ آ کر ملنے

کا کہا جہاں وہ مجھ سے مزید بات چیت کر سکتا تھا۔ اسے جتنی عزت دی جا رہی تھی اس سے میں نے یہی اندازہ لگایا کہ وہ کوئی بہت اہم شخص تھا اور وہ میڈم باسل سے جس پدرانہ شفقت کا مظاہرہ کر رہا تھا، اس سے یوں لگتا تھا کہ وہ اس کا معترف تھا۔ اسی طرح مجھے یاد ہے کہ اُس سے اس جان پہچان کو قابلِ عزت سمجھا جا رہا تھا۔ اس کے اپنے گناہوں پر نادم ہونے کی وجہ سے بھی اس کی عزت کی جا رہی تھی۔ اس نے آج کی نسبت اس وقت مجھ پر کم اثر کیا تھا۔ اگر میں ذرا تجربہ کار ہوتا تو میں ایک ایسی نوجوان خاتون کو متاثر کرنے پر خود کو مبارک باد دیتا جس کا معترف اس کی اتنی عزت کرتا تھا۔ میز پر اتنی جگہ نہ تھی کہ سب بیٹھ سکتے اس لیے ایک چھوٹا میز لگایا گیا تھا، جہاں میں نے اس کلرک کے ساتھ کھانا کھایا۔ لیکن وہاں بھی مجھے اتنی ہی توجہ ملی کیونکہ کئی پلیٹیں اس میز پر بھیجی جا رہی تھیں جو اصل میں اس کے لیے نہ تھیں۔ اب تک سب ٹھیک جا رہا تھا۔ خواتین اپنے موڈ میں تھیں اور مرد حضرات بہت پُر تکلف جبکہ میڈم باسل ایک خاص دلکشی کے ساتھ سب کو توجہ دے رہی تھیں۔ کھانے کے دوران ہمیں دروازے پر ایک تانگہ رُکنے کی آواز اور ساتھ ہی کسی کے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آنے کی آواز سنائی دی۔ یہ مسٹر باسل تھا۔ میرا خیال ہے میں اب بھی اُسے سنہرے بٹنوں والے کوٹ پہنے اندر داخل ہوتے دیکھ رہا ہوں اور اس دن سے مجھے اس (سرخ) رنگ سے نفرت ہو گئی ہے۔ وہ ایک لمبے قد کا مالک تھا اور ہر ایک کو اپنی جانب متوجہ کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ وہ اس طرح اندر داخل ہوا جیسے وہ اپنے گھر والوں کے تعاقب میں ہو اور انہیں اس وقت پکڑ لیا ہو جب وہ اس کی اُمید نہ کر رہے تھے، حالانکہ وہاں صرف دوست موجود تھے۔ اس کی بیوی اسے ملنے کے لیے اس کی طرف دوڑی، اس نے اپنے بازو اپنے خاوند کی گردن میں ڈال دیئے اور اسے ہزاروں بوسے دیے جن کو اس نے کوئی اہمیت نہ دی۔ وہ واپس نہ پلٹا بلکہ سب کو سلام کر کے ادھر ہی بیٹھ گیا۔ ابھی وہ اس کے سفر کے متعلق بات کرنے ہی لگے تھے کہ اس کی نظر چھوٹے میز پر پڑی اور اس نے تیز آواز میں پوچھا کہ یہ لڑکا کون ہے؟ میڈم باسل نے سادگی سے اس کا جواب دیا، اس نے پھر پوچھا کہ کیا میں (اُسی) گھر میں رہتا تھا، جس کا جواب اسے نفی میں ملا۔ اس پر اس نے کہا "کیوں نہیں"؟ کہ جب میں سارا دن وہیں رہتا تھا تو رات بھی وہیں رہنے میں کیا حرج تھا؟ اب اس راہب نے میڈم باسل کی سنجیدگی اور سچائی سے تعریف کرتے ہوئے مداخلت کی۔ اس نے چند الفاظ میں میری تعریف بھی کی اور یہ بھی کہا کہ اپنی بیوی پر الزام لگانے کی بجائے اُسے اس کی نیکی میں اس کی مدد کرنی چاہئے۔ کیونکہ یہ صاف نظر آ رہا تھا کہ اس نے تمیز ــــــ کی حدود پار نہ کی تھیں۔ میڈم باسل نے اس کا جواب اتنی بدتمیزی سے دیا کہ شاید اس سے میرا سانس ہی رک

جاتا، (گوراھب نے اسے روک دیا) بہر کیف اس سے مجھے اتنا اندازہ ضرور ہو گیا کہ اسے میرے بارے میں معلومات مل چکی تھیں اور یہ کہ ہمارے قابل کلرک نے میرے لیے ایک بڑے دفتر کا انتظام کر دیا تھا۔

ابھی ہم بمشکل میز سے اُٹھے ہی تھے، جب وہ کلرک اپنے مالک کے پاس سے کامیاب ہو کر میرے پاس یہ بتانے آیا کہ مجھے اُسی لمحے گھر چھوڑنا ہو گا اور یہ کہ میں اپنی زندگی میں دوبارہ کبھی وہاں قدم نہ رکھوں۔ اُس نے اس بات کا خاص خیال رکھا کہ وہ اس حکم کے ساتھ میری جتنی بے عزتی کر سکتا تھا اس میں کمی نہ رہ جائے۔ میں بغیر ایک لفظ کہے وہاں سے چلا آیا۔ میرا دل میڈم باسل کو اس کے بے رحم خاوند کے پاس چھوڑنے پر دکھی تھا اور یہ دکھ اس تکلیف سے زیادہ تھا جو مجھے اس ملنسار خاتون سے دور بھیجے جانے پر تھا۔ اس کے خاوند کی اس سے وفاداری بجا تھی اگرچہ وہ محتاط تھی یعنی نرم دل، لیکن وہ کینہ پرور تھی! جو مجھے یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ اس نے وہ طریقہ استعمال کر کے جو دنیا میں غالباً عام تھا نہایت بے احتیاطی کا مظاہرہ کیا تھا کہ اس سے اس نے ہر اُس بُرائی کو دعوت دے ڈالی جس سے وہ بچنا چاہتا تھا۔

میری پہلی مہم کی کامیابی ایسی ہی تھی۔ میں نے اسے دیکھنے کے لیے کئی بار سڑک پر چکر لگائے جس پر میرا دل مسلسل پچھتا رہا تھا لیکن مجھے صرف اس کا خاوند نظر آتا یا پھر وہ چوکنا کلرک تھا جو مجھے دیکھ کر دکان میں استعمال ہونے والے ایل (کپڑے ماپنے کا پیمانہ جو پہلے استعمال میں تھا) سے نشان بناتا جو دلفریب ہونے سے زیادہ پُر معنی تھا۔ یہ جانتے ہوئے کہ مجھ پر مسلسل نظر رکھی جا رہی تھی۔ میری ہمت جواب دے گئی اور میں نے وہاں جانا چھوڑ دیا۔ میں اس شخص کو ڈھونڈنا چاہتا تھا جس سے اس نے مجھے متعارف کروایا تھا لیکن بدقسمتی سے مجھے اس کا نام معلوم نہ تھا۔ میں نے چرچ کے گرد اس اُمید پر کئی چکر لگائے کہ شاید میں اس سے مل سکوں لیکن میری تمام کوششیں ناکام ہو گئیں۔ غرضیکہ دوسری چیزوں نے میڈم باسل کی یاد میرے دل سے کم کر دی۔ کچھ ہی عرصے میں، میں اسے اتنا بھول گیا کہ میں ہمیشہ کی طرح سادہ اور ناتجربہ کار ہو گیا۔ میری عورتوں کی طرف رغبت میں کبھی کوئی خاص اضافہ نہ ہوا۔

اس کی سخاوت کی وجہ سے البتہ میری کپڑوں کی الماری میں کچھ اضافہ ہو گیا تھا اگرچہ اس نے یہ بہت احتیاط اور خیال سے کیا تھا۔ اس نے سجاوٹ سے زیادہ صفائی کا خیال رکھا تھا اور اس بات کا بھی کہ ان کپڑوں میں، میں شوخ سے زیادہ آرام دہ رہوں۔ وہ کوٹ جو میں جنیوا لایا تھا ابھی قابل استعمال تھا۔ اس نے اس کے ساتھ ایک ٹوپی اور کچھ لینن (Linen) کا اضافہ کیا تھا۔

میرے کسی کپڑے میں چٹنیں نہ تھیں۔لیکن اب مجھے ان کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔وہ اس بات سے مطمئن تھی کہ مجھ میں خود کو صاف ستھرا رکھنے کی صلاحیت پیدا ہو گئی تھی اگرچہ اس کے سامنے جانے کے لیے یہ غیر ضروری تھا۔

اس واقعے کے چند دن بعد میری میزبان خاتون (جو میں دیکھ رہا تھا کہ بہت مہربان تھی) نے اطمینان سے مجھے بتایا کہ اسے ایک جگہ کا پتہ چلا تھا جہاں ایک اونچے عہدے کی خاتون مجھ سے ملنا چاہتی تھی۔میرے ذہن میں فوراً یہ خیال آیا کہ اب مجھے مزید دلچسپ مہمات کا سامنا کرنا ہوگا کہ میرے ذہن میں صرف یہی خیالات رہتے تھے لیکن حالات میری اُمیدوں سے مختلف تھے۔میں اس خاتون اور اس کے ملازم کا انتظار کرتا رہا۔اس نے مجھ سے کافی سوالات پوچھے اور وہ میرے جوابات سے مطمئن تھی اس لیے اس نے مجھے فوراً نوکری دے دی مگر وہ کوئی خاص عہدہ نہ تھا۔اس نے مجھے ایک اردلی کے طور پر رکھا تھا۔مجھے دوسرے لوگوں کی طرح کپڑے پہننے پڑتے اور ان میں اور میرے لباس میں صرف ایک (Shoulder Knot) ربن یا فیتے کی سجاوٹی گرہ جو سترھویں اور اٹھارویں صدی میں کندھے پر ڈالنے کا رواج تھا۔خاص طور پر مردوں کے لیے استعمال ہوتی تھی اور پہننے والے کے سپرد کئے گئے فرض کی طرف اشارہ کرتی تھی)۔سجاوٹی گرہ کا فرق تھا جو میرے پاس نہ تھی۔کیونکہ اس (کی وردی) میں لیس (Lace) نہ تھی اور وہ صرف ایک مزدور کا لباس لگتا تھا۔یہ میری تمام اونچی اونچی اُمیدوں کا غیر متوقع نتیجہ تھا!!!

میں اب Counters of Vercellis کے پاس رہتا تھا،ایک بیوہ عورت تھی جس کی کوئی اولاد نہ تھی۔اس کا خاوند پائیڈمونٹ کا رہنے والا تھا مگر مجھے یقین تھا کہ وہ خود ایک سیوائیرڈ تھی کیونکہ مجھے بالکل اندازہ نہ تھا کہ پائیڈمونٹ کا رہنے والا کوئی شخص اتنی اچھی اور اتنے خالص لہجے میں فرانسیسی بول سکتا تھا۔وہ درمیانی عمر کی ایک عورت تھی۔اس کے حلئے سے لگتا تھا کہ وہ مہذب اور اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتی ہے اور عقل وفراست کی مالک ہے ___ وہ فرانسیسی ادب سے خاص شغف رکھتی تھی اور اس میں ماہر بھی تھی۔اس کے خطوط میں ایک خاص اسلوبِ بیان تھا اور تقریباً میڈم ڈی سوائن کی سی شستگی بھی تھی۔کبھی کبھی تو مجھے ایسا گمان ہوتا کہ یہ میڈم ڈی سوائن ہی ہے۔میرا اصل کام جو مجھے کسی طرح بھی پسند نہ تھا وہ اس کے کہنے پر خطوط لکھنا تھا۔اسے سینے کا کینسر تھا جس سے اسے بہت تکلیف رہتی تھی اور اس کی وجہ سے وہ خود نہ لکھ سکتی تھی۔

میڈم ڈی ورسل نہ صرف اچھی سمجھ بوجھ رکھتی تھی بلکہ وہ ایک اچھی اور اعلیٰ وارفع روح کی بھی مالک تھی۔میں اس کی آخری بیماری میں اس کے پاس تھا۔میں نے اسے تکلیف برداشت

کرتے اور مرتے دیکھا۔ اس نے ایک لمحے کے لیے بھی اپنی کمزوری یا تکلیف کو ظاہر نہ ہونے دیا اور اپنی نسوانیت کو برقرار رکھا۔ اس نے یہ بالکل نہ پتہ چلنے دیا کہ اس کا یہ صبر اور قوت برداشت اسے فلسفے سے متعارف کرا دے گی۔ اس وقت یہ لفظ ابھی عام نہ ہوا تھا اور نہ ہی اُسے اس کی اہمیت کا اندازہ تھا جو کہ فلسفے کو اب اسے دی جاتی ہے۔ اس کے روّیے کی یہ مضبوطی کبھی کبھی سرد مہری میں تبدیل ہو جاتی تھی اور وہ دوسروں کا بھی اتنا کم خیال کرتی جتنا کہ وہ اپنا کرتی تھی۔ اس کا مقصد دوسروں پر ترس کھانے کے بجائے صرف اپنا عمل صحیح رکھنا تھا۔ میں نے جو تین مہینے اس کے پاس گزارے اس میں اکثر اس بے حسی کو محسوس کیا تھا۔ ایک ایسے لڑکے کے بارے میں اچھی رائے رکھنا ایک فطری بات تھی۔ جس میں کچھ صلاحیتیں تھیں اور جو مسلسل اس کی نگرانی میں رہتا تھا۔ اسے یہ سوچنا چاہیے تھا کہ جب اسے اپنی موت کا وقت قریب آتا محسوس ہو رہا تھا تو ایسے میں، میں اپنی مدد اور سہارا فراہم کر سکتا تھا۔ لیکن وہ یا تو مجھے اس قابل نہ سمجھتی تھی یا پھر وہ لوگ جو اس کے ہر عمل کو دیکھتے رہتے تھے وہ اسے اپنے علاوہ کسی کے بارے میں سوچنے نہ دیتے تھے۔ اس نے میرے لیے کچھ نہ کیا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس نے میری کہانی سننے میں کچھ تجسّس کا اظہار کیا تھا اور مجھ سے کئی سوالات پوچھے تھے۔ وہ میرے ان خطوط کو دیکھ کر بھی متاثر ہوئی تھی جو میں نے میڈم ڈی ویرن کے نام لکھے تھے یا جب میں نے اپنے جذبات کا اظہار کیا تھا۔ اس نے یقیناً ان تک پہنچنے کے لیے صحیح ذرائع کا استعمال نہ کیا تھا۔ میرا دل جو فطری طور پر باتونی تھا اور اپنے جیسے کسی انسان سے ملکر اپنے جذبات کا اظہار کرنے میں خوشی محسوس کرتا تھا۔ لیکن خشک اور سرد سوالات جن کے جوابات پر مجھے کسی الزام یا پسندیدگی کا احساس نہ ہو مجھے اعتماد نہ دیتے تھے۔ مجھے چونکہ یہ معلوم نہ تھا کہ میرا روّیہ قابل قبول تھا یا ناراضگی کا باعث سو میں ہمیشہ خوفزدہ رہتا اور اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے بجائے میرا دھیان اس بات میں ہوتا کہ میں ایسی کوئی بات نہ کروں جو میرے لیے نقصان کا سبب بنے۔ تب سے میرا یہ خیال ہے کہ لوگوں کے کردار کے بارے میں سوال کرنے کا یہ خشک طریقہ ان لوگوں میں عام ہوتا ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ وہ عقل و فراست رکھتے ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اپنے احساسات کو چھپا کر دوسروں کے احساسات کو جان لیں گے۔ لیکن یہ طریقہ اس اعتماد کو مجروح کر دیتا ہے جو دوسروں کو بے نقاب کرنے کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ جب کسی شخص سے سوال کیے جاتے ہیں تو وہ فوراً اپنے بچاؤ کے بارے میں سوچنے لگتا ہے۔ اگر وہ اس بات کو فرض کر لے کہ آپ اس میں دلچسپی نہیں رکھتے اور صرف اس سے کچھ اگلوانا چاہتے ہیں تو یا وہ آپ سے جھوٹ

بولے گا یا خاموش ہو جائے گا یا پھر وہ اپنے منہ سے لفظ بہت سوچ سمجھ کر نکالے گا۔ وہ خود کو بے وقوف تو ثابت کر سکتا ہے لیکن آپ کے تجسس کے سامنے احمق نہ بنے گا۔ غرضیکہ اپنے دل کی بات چھپا کر دوسروں کے دلوں کو پڑھنے کی کوشش ہمیشہ غلط ہوگی۔

میڈم ڈی ورسل نے مجھ سے کبھی کوئی ایسی بات نہ کی جس سے اس کی محبت، ترس یا خیر اندیشی کا پتہ چلتا ہو۔ وہ سرد مہری سے مجھ سے سوال کرتی اور میرے جوابات میں بُزدلی نمایاں ہوتی تھی کہ اس نے یقیناً میرے بارے میں ایک بُرا تاثر قائم کیا ہوگا کیونکہ بعد میں اس نے کبھی مجھ سے کوئی سوال کیا نہ ہی جب تک اسے اپنے کام کے لیے ضرورت پڑتی وہ کوئی بات کرتی۔ وہ میرے بارے میں کوئی فیصلہ کرتے وقت یہ نہ سوچتی کہ میں اصل میں کیا تھا بلکہ وہ یہ دیکھتی کہ اس نے مجھے کیا بنایا۔ چونکہ اس نے مجھے اردلی رکھا ہوا تھا سو وہ میرے بارے میں کچھ اور نہ سوچ سکتی تھی۔

میں یہ سوچنے پر مجبور ہوں کہ میں اُس وقت نادیدہ سازشوں کے کھیل میں پھنسا ہوا تھا جس کا اثر تمام زندگی مجھ پر رہا ہے اور جس سے میرے اندر ہر اس چیز سے نفرت پیدا ہوگئی ہے جس میں اس چیز کا ہلکا سا بھی شائبہ ہو۔ میڈم ڈی ورسل چونکہ کوئی بچے نہ تھے سو اس کا بھانجا The Count de La Roque ہی اس کا وارث تھا۔ جو اس کے دوسرے رشتہ داروں کی طرح اس کی موت کو قریب دیکھ کر باقاعدگی سے اس کے پاس آنے لگے تھے۔ وہ سب اپنے اپنے فائدوں کے لیے اس کے پاس آتے تھے۔ حقیقت یہ تھی کہ اس کے اردگرد اتنے لوگ تھے کہ اسے میرے بارے میں سوچنے کا خیال بھی نہ آیا۔ اس کے گھر کا نگران کوئی مسٹر لورنزی تھا، وہ ایک چلتا پرزہ تھا اور اس کی بیوی اس سے بھی تیز تھی۔ وہ اب تک اپنی مالکن کے دل میں اپنی اتنی جگہ بنا چکی تھی کہ میڈم ڈی ورسل اپنے سے اپنی ملازمہ کو زیادہ دوست سمجھتی تھیں۔ اس نے اپنی ایک بھانجی بھی وہیں ملازمہ رکھوا دی تھی۔ اس کا نام میڈم اوئےسل پائعل تھا جو ایک ہوشیار خانہ بدوش عورت تھی۔ اس لیے وہ بالکل ایک انتظار کرنے والی خاتون (Waiting Woman) لگتی تھی۔ یہ بات اس کی خالہ کے لیے بھی درست ثابت ہوئی کہ اس سے وہ نواب زادی کو اپنے گھیرے میں لے سکتی تھی تاکہ وہ صرف ان کی نظروں سے دیکھے اور ان کے ہاتھوں کو استعمال کرے۔ مجھے اس اہم اتحاد ثلاثہ کو خوش کرنے کا کوئی موقع نہ نصیب ہوا۔ میں ان کا حکم مانتا تھا مگر ان کے (حکم کا) منتظر نہ رہتا تھا کیونکہ میں یہ سمجھتا تھا کہ میں اپنی مالکن کے خادموں کی خدمت بجالانا اپنا فرض نہ سمجھتا تھا۔ اس کے علاوہ میں ایک ایسا شخص تھا جس کی وجہ سے انہیں بے چینی رہتی۔ وہ دیکھ رہی

بولے گا یا خاموش ہو جائے گا یا پھر وہ اپنے منہ سے لفظ بہت سوچ سمجھ کر نکالے گا۔ وہ خود کو بے وقوف تو ثابت کر سکتا ہے لیکن آپ کے تجسس کے سامنے احمق نہ بنے گا۔ غرضیکہ اپنے دل کی بات چھپا کر دوسروں کے دلوں کو پڑھنے کی کوشش ہمیشہ غلط ہوگی۔

میڈم ڈی ورسل نے مجھ سے کبھی کوئی ایسی بات نہ کی جس سے اس کی محبت، ترس یا خیر اندیشی کا پتہ چلتا ہو۔ وہ سرد مہری سے مجھ سے سوال کرتی اور میرے جوابات میں بُودلی نمایاں ہوتی تھی کہ اس نے یقیناً میرے بارے میں ایک بُرا تاثر قائم کیا ہوگا کیونکہ بعد میں اس نے کبھی مجھ سے کوئی سوال کیا نہ ہی جب تک اسے اپنے کام کے لیے ضرورت پڑتی وہ کوئی بات کرتی۔ وہ میرے بارے میں کوئی فیصلہ کرتے وقت یہ نہ سوچتی کہ میں اصل میں کیا تھا بلکہ وہ یہ دیکھتی کہ اس نے مجھے کیا بنایا۔ چونکہ اس نے مجھے اردلی رکھا ہوا تھا سو وہ میرے بارے میں کچھ اور نہ سوچ سکتی تھی۔

میں یہ سوچنے پر مجبور ہوں کہ میں اُس وقت نادیدہ سازشوں کے کھیل میں پھنسا ہوا تھا جس کا اثر تمام زندگی مجھ پر رہا ہے اور جس سے میرے اندر ہر اس چیز سے نفرت پیدا ہو گئی ہے جس میں اس چیز کا ہلکا سا بھی شائبہ ہو۔ میڈم ڈی ورسل چونکہ کوئی بچے نہ تھے سو اس کا بھانجا The Count de La Roque ہی اس کا وارث تھا۔ جو اس کے دوسرے رشتہ داروں کی طرح اس کی موت کو قریب دیکھ کر باقاعدگی سے اس کے پاس آنے لگے تھے۔ وہ سب اپنے اپنے فائدوں کے لیے اس کے پاس آتے تھے۔ حقیقت یہ تھی کہ اس کے اردگرد اتنے لوگ تھے کہ اسے میرے بارے میں سوچنے کا خیال بھی نہ آیا۔ اس کے گھر کا نگران کوئی مسٹر لورنزی تھا، وہ ایک چلتا پرزہ تھا اور اس کی بیوی اس سے بھی تیز تھی۔ وہ اب تک اپنی مالکن کے دل میں اپنی اتنی جگہ بنا چکی تھی کہ میڈم ڈی ورسل اپنے سے اپنی ملازمہ کو زیادہ دوست سمجھتی تھیں۔ اس نے اپنی ایک بھانجی بھی وہیں ملازمہ رکھوا دی تھی۔ اس کا نام میڈم اوئے سل پاٹل تھا جو ایک ہوشیار خانہ بدوش عورت تھی۔ اس لیے وہ بالکل ایک انتظار کرنے والی خاتون (Waiting Woman) لگتی تھی۔ یہ بات اس کی خالہ کے لیے بھی درست ثابت ہوئی کہ اس سے وہ نواب زادی کو اپنے گھیرے میں لے سکتی تھی تا کہ وہ صرف ان کی نظروں سے دیکھے اور ان کے ہاتھوں کو استعمال کرے۔ مجھے اس اہم اتحاد ثلاثہ کو خوش کرنے کا کوئی موقع نہ نصیب ہوا۔ میں ان کا حکم مانتا تھا مگر ان کے (حکم کا) منتظر نہ رہتا تھا کیونکہ میں یہ سمجھتا تھا کہ میں اپنی مالکن کے خادموں کی خدمت بجالانا اپنا فرض نہ سمجھتا تھا۔ اس کے علاوہ میں ایک ایسا شخص تھا جس کی وجہ سے انہیں بے چینی رہتی۔ وہ دیکھ رہی

تھیں کہ میں اپنی صحیح جگہ پر ___ نہیں تھا۔ انہیں خطرہ تھا کہ نواب زادی بھی یہ محسوس کرے گی اور پھر مجھے میری صحیح جگہ پر لیجا کر ان کا حصہ کم کر دے گی۔ کیونکہ ایسے لوگ تو اتنے لالچی ہوتے ہیں کہ انصاف نہیں کر سکتے کیونکہ وہ دوسروں کو ملنے والی ہر چیز کو اپنی دولت میں کمی تصور کرتے ہیں۔ سو وہ کوشش کرتیں کہ میں جتنا ممکن ہو اس کی نظروں سے دور رہوں۔ اُسے اس حالت میں خط لکھنا پسند تھا مگر وہ اسے اُس سے دور کرنے کی سازشیں کرتی رہتیں۔ وہ معالج کی مدد سے اسے یقین دلاتیں کہ یہ بہت تھکا دینے والا کام تھا۔ غرضیکہ انھوں نے یہ معاملہ اتنی خوش اسلوبی سے طے کیا کہ نواب زادی کے اپنی وصیّت نامے کے آٹھ دن قبل سے مجھے اس کے کمرے میں داخل نہ ہونے دیا گیا۔ اس کے بعد میں اپنے معمول کے مطابق وہاں جاتا رہا اور میں اس نیک خاتون کی تکلیف سے متاثر ہو کر اسے ان سے زیادہ گہری توجہ دیتا۔ میں اسے اس کے اطمینان اور صبر سے اپنی تکلیف برداشت کرنے کی وجہ سے اس کی سچے دل سے عزت اور محبت کرتا تھا۔ اکثر میں نے اس کے لیے حقیقی دکھ سے آنسو بھی بہائے جنھیں کسی نے نہ سمجھا۔

غرضیکہ میں نے اسے ختم ہوتے دیکھا۔ اس نے ایک نیک اور عقلمند عورت کی طرح زندگی گزاری تھی اور اس کی موت ایک فلسفی کی موت تھی۔ فطری طور پر وہ ایک سنجیدہ عورت تھی لیکن جیسے جیسے اس کا وقت قریب آتا جاتا' اس کے اندر باقاعدہ ایک خوش مزاجی آتی جاتی تھی جو اس کی غمناک صورتحال کو متوازن کرنے میں مدد دیتی تھی۔ وہ صرف دو دن اپنے بستر پر رہی اور اپنے گرد موجود لوگوں سے خوشی سے باتیں کرتی رہی۔ بالآخر جب وہ بمشکل کوئی بات کرنے کے قابل رہی اور جان کنی کی حالت میں تھی تو اس نے ریح خارج کی اور مڑ کر بولی ''جو عورت ریح خارج کر سکتی ہے وہ یقیناً ابھی زندہ ہے''...... یہ اس کے آخری الفاظ تھے۔

اس کی وصیّت کے مطابق تمام ادنیٰ ملازمین کو ان کی ایک سال کی تنخواہوں کے برابر پیسے دیئے جانے تھے۔ میں چونکہ گھر کے ملازمین میں شامل نہ تھا اس لیے مجھے کچھ نہ ملا۔ Count de La Roque نے البتہ مجھے تیس لیورز میں وہ نیا کوٹ دیا جو میں نے پہن رکھا تھا اور جو یقینی طور پر مسٹر لورنزی نے مجھ سے لے لینا تھا۔ اس نے مجھ سے یہ وعدہ کیا کہ وہ مجھے کہیں نوکری دلوا دے گا اور مجھے اس بات کی اجازت بھی دی کہ میں اپنی مرضی کے مطابق اس کے لیے کام کر سکتا ہوں۔ سو میں نے دو یا تین بار کوشش کی مگر میں اس سے کوئی بات نہ کر سکا اور مجھے چونکہ پیچھے ہٹانا بہت آسان تھا سو میں اس کے بعد دوبارہ اس کے پاس نہ گیا۔ یہ میں نے ٹھیک کیا یا غلط اس کا اندازہ آپ آئندہ ملاحظہ کر لیں گے۔

کیا میں نے وہ سب لکھ دیا ہے جو میں اپنے میڈم ڈی ورسل کے گھر رہائش کے بارے میں لکھنا چاہتا تھا؟ اگرچہ میری حالت کم وبیش ویسی ہی رہی لیکن میں وہاں سے ویسے رخصت نہ ہوا جیسے میں وہاں آیا تھا۔ میں دل میں کسی جُرم کا احساس لیے دکھ کے ساتھ وہاں سے رخصت ہوا اور یہ احساس ایک لمبے عرصے تک میرے ساتھ رہا۔ اس کی تلخ یاد چالیس برس کے عرصے میں کم ہونے کے بجائے میری عمر کے ساتھ بڑھتی جاتی ہے۔ کون یقین کرے گا کہ بچپن میں کی جانے والی ایک غلطی کے ایسے افسوسناک اثرات مرتب ہوں گے؟ لیکن اس کا اثر ان ممکنہ نتائج سے زیادہ ہے اور میرے دل کی کسی صورت تشفی نہیں ہو پاتی۔ ایک ملنسار، سچی اور لائق احترام لڑکی جو یقیناً مجھ سے زیادہ اچھی قسمت کے قابل تھی شاید میں نے اس کو شرمندگی اور نا آسودگی کی حالت میں مرنے کے لیے چھوڑ دیا تھا۔

اگرچہ گھر کے کاموں سے بغیر کسی پریشانی کے علیحدہ ہونا اتنا آسان نہ تھا لیکن گھر کے ملازمین کی وفاداری اور مسٹر اینڈ میڈم لورنزی کی ہوشیاری کا یہ عالم تھا کہ گھر کی کسی چیز کا کوئی اُمیدوار نہ تھا۔ غرضیکہ ہر چیز اپنی جگہ موجود تھی سوائے اس گلابی اور نقرئی رنگ کے ربن کے، جو میڈم اوئے سل پوٹل کا تھا اور وہی اسے پہنتی تھی اگرچہ میری پہنچ دوسری کئی چیزوں تک تھی۔ لیکن اس ربن نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا تھا سو میں نے اسے چُرا لیا۔ چونکہ میں نے اس چھوٹی سی چیز کو چھپانے کی کوئی کوشش نہ کی تھی سو جلد ہی اس کا پتہ لگا لیا گیا اور انھوں نے فوراً اس بات پر اصرار کیا کہ میں نے اسے کہاں سے حاصل کیا ہے۔ اس سے میں پریشان ہو گیا اور بالآخر میں نے الجھ کر یہ کہا کہ وہ مجھے مارین نے دیا تھا۔

مارین ایک کم عمر لڑکی تھی جو میڈم ڈی ورسل کے پاس بطور باورچی کام کرتی تھی۔ جب سے اس نے دعوتیں کرنی چھوڑی تھیں اس بات کا احساس کرتے ہوئے کہ اسے معالجوں والی چیزوں کے بجائے یخنی کی ضرورت تھی، اس نے پہلے ملازم کو نکال دیا تھا۔ مارین نہ صرف پیاری تھی بلکہ اس کی رنگت میں وہ تازگی تھی جو عموماً پہاڑی لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اس میں حیاء اور مٹھاس تھی کہ اس سے پیار نہ کرنا ناممکن تھا۔ وہ ایک اچھی لڑکی ہونے کے ساتھ ساتھ نیک اور وفادار تھی کہ ہر کوئی اس کا نام سن کر حیران رہ گیا۔ انہیں مجھ پر بھی کوئی کم اعتبار نہ تھا سو انھوں نے یہ فیصلہ کرنا مناسب سمجھا کہ ہم میں سے کون چور ہے؟ مارین کو بلایا گیا، اور بہت سے لوگ بھی موجود تھے جن میں Count de La Roque بھی شامل تھا۔ وہ آئی تو انھوں نے اسے وہ ربن دکھایا۔ میں نے کھلے عام اس پر الزام لگایا۔ وہ پریشان اور گم سم تھی اور مجھے ایسی نظروں سے دیکھ رہی تھی کہ

میری جگہ شیطان بھی ہوتا تو بھاگ جاتا مگر میرا بے رحم دل ٹس سے مَس نہ ہوا۔ غرضیکہ اس نے صفائی سے مگر بغیر غصے کے انکار کر دیا۔ اس نے مجھے اپنی اصلیت پر آنے کو کہا اور یہ بھی کہا کہ مجھے ایک ایسی معصوم لڑکی کو نقصان نہیں پہنچانا چاہیے جس نے میرے ساتھ کوئی برائی نہ کی تھی۔ میں انتہائی بدتمیزی کے ساتھ اس پر الزام لگاتا رہا اور اس کے منہ پر یہ کہتا رہا کہ اس نے مجھے وہ ربن دیا تھا۔ اس پر اُس بے چاری لڑکی نے روتے ہوئے یہ الفاظ کہے "آہ روسو! میں تمہیں اچھا انسان سمجھتی تھی لیکن تم نے مجھے بہت دکھ دیا ہے مگر میں ہار نہیں مانوں گی"۔ وہ اپنا بچاؤ کرتی رہی لیکن اس نے میرے خلاف کوئی غلط بات نہ کی۔ اس کا تحمل اور میرا وثوق سے اپنی بات پر قائم رہنا اس کو نقصان پہنچا گیا کیونکہ ایسا فرض کر لینا فطرت کے خلاف ہے کہ ایک طرف تو شیطانی یقین دہانی کرائی جا رہی ہو اور دوسری طرف فرشتوں کی سی نرمی۔ اس معاملے کا کوئی حتمی نتیجہ نہ نکل سکا لیکن قیاس میرے ہی حق میں تھا ____Count de La Roque نے ہم دونوں کو واپس بھجواتے ہوئے یہ کہہ کر خود کو مطمئن کیا کہ "مجرم کا ضمیر ہی بے گناہ کا قرض چکا سکے گا"۔ اس کی پیش گوئی سچ تھی اور ہر روز اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

مجھے نہیں معلوم کہ میں نے جس پر الزام لگایا تھا، اس کا کیا بنا؟ لیکن اس بات کا بہت کم امکان ہے کہ وہ خود کو اس کے بعد قائم رکھ سکی ہو کیونکہ اس نے خود پر لگائی جانے والی ایسی تہمت پر بہت تکلیف اُٹھائی تھی جو اس کے کردار کے لیے ہر اعتبار سے بڑی تھی۔ چوری تو ایک معمولی سی بات تھی مگر تھی تو وہ آخر کار چوری ہی اور اس پر قیامت یہ کہ وہ ایک لڑکے کو بہکا رہی تھی جبکہ جھوٹ اور ڈھٹائی نے ایک ایسے شخص سے مزید کوئی اور اُمید رکھنے کی کسر نہ چھوڑی تھی جس میں اتنی بُرائیاں یکجا ہو گئی ہوں۔ میں نے تو اس بے عزتی اور تباہی کے بارے میں بھی نہ سوچا تھا جس میں، میں نے اسے دھکیل دیا تھا۔ کون جانتا ہے اس عمر میں دی جانے والی ذلت اور اس کی معصومیت کو نظر انداز کرنے سے وہ کس راہ پر جا نکلی ہو؟ آہ! اگر اس کو دکھ پہنچانے پر ہی میرے ضمیر کی خلش نا قابل برداشت ہے تو اگر میں اس کو خود سے بھی بُرا خیال کرتا تو مجھے کیا کیا برداشت کرنا پڑتا؟ اس واقعے کی بے رحم یاد کبھی کبھی مجھے اتنا پریشان کرتی ہے کہ میں اندر سے درہم برہم ہو جاتا ہوں جبکہ میں اپنی مضطرب نیند میں اُس بے چاری لڑکی کو داخل ہوتے اور اپنے جرم پر سرزنش کرتے دیکھتا ہوں جیسے میں نے یہ جرم کل ہی کیا ہو۔ جبکہ عام اور پُر سکون حالات میں، میں اس پر کم پریشان ہوتا ہوں۔ مگر جب میری زندگی مشکل میں ہوتی ہے تو میری بے گناہی مجھے بے انتہا دق کرتی ہے اور اشک شوئی کے اس خوبصورت احساس سے مجھے محروم کر دیتی ہے اس سے مجھے وہ المناک تجربہ ہوتا

ہے جس کا ذکر میں نے اپنی کئی تحریروں میں کیا ہے اور وہ یہ کہ آپ کے ضمیر کی خلش، خوشحالی کی دھوپ میں سوتی ہے لیکن یہ بدبختی میں جاگ اُٹھتی ہے۔ میں کبھی اپنے دل کا یہ بوجھ اپنے کسی دوست کے سینے میں منتقل نہیں کر پایا اور کبھی بھی بے انتہا، بے تکلفی کے باوجود مجھ میں ہمت نہیں آ سکی یہاں تک کہ میڈم ڈی ویرن ساتھ بھی نہیں۔ میں صرف اتنا ہی کر پایا کہ میں نے تسلیم کیا کہ مجھ سے بہت بڑا گناہ ہوا ہے مگر میں نے اصل میں کیا کیا تھا یہ میں نہ بتا سکا۔ سو اس کا بوجھ آج بھی میرے سینے پر ہے اور میں اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہوں کہ میری خود کو کسی حد تک اس بوجھ سے آزاد کرنے کی خواہش ہی تھی جو میرے ان اعترافات کو لکھنے کے ارادے میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔

میں نے جو کیا' اس کے بارے میں اب تک سچ لکھتا آ رہا ہوں۔ اور یقیناً یہ سوچا جائے گا کہ میں نے اپنے جرم کے بارے میں لکھ کر اپنا بوجھ ہلکا کر لیا ہے مگر میں اس منصوبے کا مقصد پورا نہیں کروں گا اگر میں ساتھ ساتھ اپنے اندرونی روّیے کے بارے میں کھل کر بیان نہ کر رہا ہوتا اور جہاں تک سچ کا تعلق ہے تو میں اس سے جان جھڑا لیتا۔

میرے خیالات سے بُرائی کبھی اتنی دور نہ تھی جتنی اس لمحے میں تھی۔ یہ بات حیران کن لیکن سچ ہے کہ جب میں نے اس اداس لڑکی پر الزام لگایا تو اس کی فوری وجہ میری اس سے دوستی تھی۔ وہ میرے خیال میں موجود تھی اور میں نے خود کو بچانے کے لیے اس کا سہارا لیا جو سب سے پہلے میرے ذہن میں آیا۔ میں نے اس پر اُس کام کا الزام لگایا جو میں خود کرنا چاہتا تھا۔ چونکہ میں خود کو اس سے ربن لینے کے بارے میں سوچ رہا تھا تو میں نے یہ الزام لگایا کہ وہ اس نے مجھے دیا ہے۔ جب وہ آئی تو میرا دل کرب میں تھا لیکن اتنے لوگوں کی موجودگی میری اس پریشانی سے زیادہ اہم تھی۔ مجھے سزا سے زیادہ شرمندگی کا خوف تھا۔ میں زمین کے سینے میں چھپ جانا چاہتا تھا۔ ناقابل تسخیر شرم باقی تمام احساسات پر بھاری تھی۔ اس نے مجھے اُس بدتمیزی پر مجبور کیا تھا۔ اور جس جس طرح میں مجرم بنتا گیا تو اپنا پول کھل جانے کا خوف مجھے نڈر کرتا گیا۔ مجھے اس سے زیادہ اور کسی چیز کا خوف نہ تھا کہ میرا پول کھل جائے گا یا مجھے کھلے عام میرے منہ پر چور، جھوٹا اور بدگو کہا جائے گا۔ یہ ناقابل تسخیر خوف میرے بقیہ تمام احساسات پر چھا گیا۔ اگر مجھے (اکیلا) چھوڑ دیا جاتا تو یقینی طور پر سچ اُگل دیتا۔ یا اگر M. de La Roque مجھے ایک طرف لے جاتے اور یہ کہتے ''اس غریب لڑکی کو تکلیف نہ دو، اگر تم مجرم ہو تو اسے تسلیم کر لو''۔ تو مجھے یقین ہے کہ میں خود کو اس کے قدموں میں گرا دیتا۔ مگر انھوں نے میری حوصلہ افزائی کے بجائے مجھے ڈرایا۔ میں نے خود کو بمشکل اپنے بچپنے سے نکالا تھا یا شاید ابھی اُسی میں تھا۔ مجھے میری عمر کی رعایت دینا انصاف ہوگا۔

نوجوانی میں گھناؤنے اور منصوبے کے تحت کیے جانے والے جرائم زیادہ بُرے ہوتے ہیں لیکن کمزوریاں جرم نہیں ہوتیں اور میری غلطی اس کے سوا اور کچھ نہ تھی۔ میں اس غلطی کے بجائے اس کے نتائج پر دکھی ہوں۔ گو اس کا ایک اچھا اثر بھی ہوا اور وہ یہ کہ اس نے مجھے اپنی بقیہ تمام زندگی میں کوئی مجرمانہ فعل کرنے سے باز رکھا کیونکہ میں نے ___ زندگی میں جو ایک ہی ایسا فعل کیا تھا اس کا بُرا اثر ساری زندگی میرے ساتھ رہا۔ اور میرا خیال ہے کہ میری جھوٹ سے نفرت کی وجہ بھی یہی ہے کہ میں اتنا گھناؤنا جھوٹ بولنے کا مرتکب ہوا تھا۔ اگر یہ کوئی ایسا جرم ہے کہ جس کا کوئی کفارہ ممکن ہے تو میں یہ یقین کرنے کی جرأت کروں گا کہ اس کے بعد چالیس سال تک مختلف مشکل مواقع پر میں نے جس دیانت داری اور عزت کا مظاہرہ، جبکہ مجھے اس زندگی میں کئی بار بدنصیبی کا سامنا کرنا پڑا تو یقیناً میں نے اپنا کفارہ ادا کر دیا ہے۔ بے چاری Marion کو اس زندگی میں کئی انتقام لینے والے مل گئے ہوں گے کہ میں نے اس کے ساتھ جتنا بھی بُرا کیا لیکن اس کا بوجھ اُٹھانے سے ڈرتا نہیں ہوں۔ سو میں اس تکلیف دہ موضوع پر جو کہنا چاہتا تھا وہ میں نے بیان کر دیا ہے۔ اور کیا مجھے دوبارہ کبھی اس کا ذکر نہ کرنے کی اجازت مل سکتی ہے ___ ؟؟؟

---

## حواشی و حوالہ جات:

۱۔ یونانی اساطیر میں اٹلس کی بیٹی جو اژدہے کی مدد سے سنہری سیبوں کے باغ کی حفاظت کرتی تھی۔